میوۂ بہشت

یکے از تصنیفات

علامہ نصیر الدین نصیر ہونزائی

خانۂ حکمت ○ اِدارۂ عارف

میوۂ بہشت

یکے از تصنیفاتِ

علاّمہ نصیر الدین نصیر ہونزائی

نسخۂ

خانۂ حکمت
اِدارۂ عارف

ISW LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

میوۂ بہشت کی

فہرستِ مضامین

شمار	عنوان	صفحہ
۱	سُخنہائے آغاز	۵
۲	تخلیق در تخلیق	۱۴
۳	عبادت میں مخفی خزانے	۲۳
۴	خوفِ خُدا اور خوفِ بیجا	۳۱
۵	حکمتِ حدیث	۴۰
۶	رُوح اور حضرتِ آدمؑ	۵۰
۷	رُوحِ اسلام	۵۹
۸	رُوح اور سائنس	۶۹
۹	مِعراج اور مَعارِج	۸۶
۱۰	سُنّتِ الٰھی	۹۵
۱۱	تطہیر وتزکیہ — ۱	۱۰۳
۱۲	تطہیر وتزکیہ — ۲	۱۱۲

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

۱۳	خانۂ خدا۔ خانۂ جماعت۔۱	۱۲۱
۱۴	خانۂ خدا۔ خانۂ جماعت۔۲	۱۳۲
۱۵	تاویلی سوالات	۱۴۱
۱۶	سلمانِ فارسی	۱۴۸
۱۷	چند اعلیٰ سوالات	۱۶۵
۱۸	اِشاراتی زبان	۱۶۹
۱۹	سورۂ ھُمَزَۃ (۱۰۴/ ۱-۹)	۱۷۸
۲۰	گُلہائے دانش	۱۸۱
۲۱	دو انتہائی عظیم فرشتے	۱۹۰
۲۲	موت کی عظیم حِکمتیں	۱۹۵

سخنہائے آغاز

بسم اللہ الرحمن الرحیم اِنّ اللہ وملٰٓئکتہٗ یصلّون علی النّبیّ ؕ
یٰٓایّھا الّذین اٰمنوا صلّوا علیہ وسلّموا تسلیمًا (۳۳: ۵۶)

اے خُداوندِ بخشندہ ومہربان! تو اپنی رحمتِ بے نہایت سے ہم جیسے عاجز وناتوان بندوں کو ایک ایسی عالی ہمّتی عنایت فرما کہ جس سے ہم خاکساران تیرے برگزیدہ اور محبُوب رسُول اور آنحضرت کی آلِ اطہار پر جیسا کہ چاہیئے بامعرفت صلوات پڑھیں : اللّٰھُمّ صلِّ علیٰ محمّدٍ وّاٰلِ محمّد۔

اے وہ ذاتِ پاک ویکتا! جو مکان ولامکان سے برتر بھی ہے اور ہماری رگِ جان سے نزدیک تر بھی، تیرے حضورِ اقدس میں جُملہ حاجاتِ ظاہری وباطنی پیش ہیں، اے خدائے احد وصمد! اے سُبُّوح وقدُّوس! ہر بندۂ مومن ہمیشہ یہی چاہتا ہے کہ جی بھر کر تیری حمد وثنا اور تعریف و توصیف کرتا رہے، لیکن اے پادشاہِ بے چُون وبے مثال! تو جانتا ہے اور کوئی حال تجھ سے پوشیدہ نہیں، کہ یہ امرِ عظیم نہ صرف عقلِ جزوی کی وجہ

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

سے سخت مُشکل ہے، بلکہ الفاظ و معانی کی تنگ دامانی کے سبب سے بھی یہ کام بدرجۂ انتہا دشوار ہے، اِس لئے یا اللہ! تو اپنی ہدایتِ الٰہی سے اِس غریب و بیچارہ دِل کو سُوز و گداز کا سرچشمہ بنا دے، تاکہ یہ بندۂ مسکین طفلِ شیرخوار کی طرح ہر حاجت و طلب کے بہانے سے خُوب خُوب آنسُو بہا سکے، تاکہ وسیلۂ رُبُوبیّت اور دایۂ عاطفت (یعنی رحمتِ خُداوندی) میری اس گریہ وزاری کی گوناگون ترجمانیاں اور تشریحیں کرے، جس طرح کوئی جسمانی مادرِ مہربان اپنے لختِ جگر کے بہتے ہُوئے آنسُوؤں کی طرح طرح سے تعبیریں کرتی ہے، مگر اِس سے آسمانی نوازشات کا موازنہ ہرگز نہیں ہو سکتا، کہ ظاہری ماں کی ماتا قطرۂ کم مقدار کی طرح ہے، اور تیری رحمت (مہر و نوازش) بحرِ بے پایان ہے۔

کتاب کا نام

یہ بہت ہی پیاری کتاب جو "میوۂ بہشت" کے پُرمغز اسم سے موسوم ہے، چند اہم اور مفید مقالات کا مجموعہ ہے، جو مختلف مواقع پر لکھے گئے تھے، جن کے آخر میں تاریخ وغیرہ درج ہے، تاکہ ناظرین و قارئین کو ہر مقالے کی اصل صُورت اور کتاب کی نوعیّت بخُوبی معلوم ہو سکے، اگرچہ بعض ایسی کتابوں میں اس اصُول پر عمل اس لئے نہیں کیا گیا ہے کہ بار بار مصنّف کا نام آنا عجیب لگتا تھا۔ تاہم مستقبل کے لئے تاریخی معلومات کے پیشِ نظر یہی طریقِ کار بہتر ہے کہ جو کتاب خطُوط اور مقالوں پر مبنی ہو، اس کے اجزاء کو اصل صُورت میں پیش کیا جائے، تاکہ تحریروں کی ترتیب اور ارتقائی شکل کا تعیّن ہو، نیز

اگر کسی سکالر نے خانۂ حکمت اور ادارۂ عارف پر تحقیق (ریسرچ) کرنے کا ارادہ کرلیا تو وہ البتّہ اپنے کام کے لئے ان چیزوں سے نتائج اخذ کرے گا۔

لفظِ "میوۂ بہشت"، کا مفہوم قرآنی حکمت میں بڑا جامع جوامع ہے، جس کی وجہ ظاہر ہے، کہ خداوندِ علیم و حکیم نے دُنیا کے تمام مادّی غذاؤں میں سے میوہ (پھل) کو منتخب فرمایا، تاکہ اس سے رُوح اور عقل کی اعلیٰ نعمتوں کی تشبیہہ و تمثیل دی جائے، اِس اِنتخاب کا سبب یقیناً یہی ہے کہ میوہ یعنی پھل (بزبانِ قرآنِ حکیم، ثمر، فاکھۃ، وغیرہ) کی مثال میں رُوحی اور عقلی جواہر کے اِشارات موجُود ہیں، جن کو صرف اہلِ دانش ہی سمجھ سکتے ہیں۔

میوۂ علمی جس طرح ہر دُنیاوی میوہ اپنے درخت کا مکمّل جوہر، خلاصہ اور نچوڑ ہُوا کرتا ہے، یعنی اس میں تمام شجر کی ہر ہر قوّت بصُورتِ جوہر موجُود ہوتی ہے، یہاں تک کہ اس میں اپنی قسم کا ایک دُوسرا درخت اُگانے کی صلاحیّت بھی پوشیدہ ہے، اسی طرح بہشتِ برین کا رُوحانی، علمی، اور عقلی میوہ ہے، جو درختِ کائنات و موجُودات کا جوہر (گوہر .....) ہے، جس کی رنگینی دیدۂ دل کے لئے، خوشبُو مشامِ جان کے لئے، اور ذائقہ رُوح و عقل کے لئے بیحد مرغوب و پسندیدہ ہے۔

گلشن یا گلزار وہ احاطہ ہے، جہاں پھُول کھلتے ہیں، اور باغ اُس چار دیواری کا نام ہے، جس میں میوہ دار درخت ہوتے ہیں، مگر

رُوحانی بہشت کی یہ کیفیت ہے کہ وہ نہ صرف گلشن در گلشن اور باغ در باغ ہے، بلکہ وہ گلشن در باغ اور باغ در گلشن بھی ہے، کیونکہ وہ جہانِ لطیف اور عالمِ امر ہے، جس میں معجزۂ امرِ کُن کی کارفرمائی ہے، اور چیزیں چشم زدن میں ظہُور پذیر ہوتی رہتی ہیں، بہرحال اگر ایک اعتبار سے دیکھا جائے تو عالمِ شخصیّت کی جنّت میں پہلے تو رُوحانیّت کے پھُول ہی پھُول نظر آتے ہیں، اور پھر علم و حکمت کے پھل ہی پھل۔

کوئی بھی ہوشمند جو قرآنِ پاک کے ظاہر سے واقف و آگاہ ہو، یہ سوال کرسکتا ہے کہ قرآنِ مقدّس میں بہشت کے پھُولوں کا ایسا تذکرہ کہاں ہے، جس کے حوالے سے آپ نے یہ ذِکر کیا ہو؟ میں جواب کے طور پر یُوں عرض کروں گا کہ قرآنِ حکیم میں بزبانِ حکمت سب کچھ مذکور ہے، چنانچہ قرآنِ کریم میں جہاں جہاں لفظِ جنّت، روضہ، حدیقہ اور بہشت کا کوئی بھی نام آیا ہے، اس میں پھُولوں کا ذکر پوشیدہ ہے، نیز جن آیاتِ کریمہ میں جنّت کے درختوں اور میووں کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا ہے، اُن میں بھی یہ بات ہے، کیونکہ جنّت (باغ)، پھل اور پھُول دونوں کا تصوّر پیش کرتی ہے، اور شجر و ثمر پھُول کے بغیر نہیں، اِس کے علاوہ ایک بڑا اہم نُکتہ یہ بھی یاد رہے کہ جس طرح حواسِ ظاہر میں سب سے اشرف حسّ بصارت ہے، اِسی طرح حواسِ باطن میں بصیرت (رُوح کی بینائی) افضل ہے، جس کے لئے جنّت میں گوناگون لطیف مناظر (دیکھنے کی چیزیں) موجود ہیں (۴۳/۷۱) جن میں لطیف پھُول بھی شامل ہیں۔

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

قرآنِ حکیم میں کئی ایسی آیات ہیں، جن کا مجموعی مفہوم یہ ہے کہ جب آسمان سے بارش برستی ہے تو مُردہ زمین زندہ ہو جاتی ہے، وہ یہ کہ زمین کا آباد حصّہ سرسبز اور گُل و گلزار بن جاتا ہے، جس کی تاویل یہ ہے کہ جب نُورِ نبوّت و امامت کے آسمان سے قلوبِ مومنین کی زمین پر حقیقی علم کی بارش برستی ہے، تو اس کے نتیجے میں انکے دِل باغہائے بہشت کے انتہائی خوب صُورت مناظر کو پیش کرتے ہیں، چُنانچہ مشاہدۂ باطن میں جہاں پھُول نظر آتے ہیں، وہ علم کی علامت ہیں، اور وہاں جیسے پھل سامنے آتے ہیں، وہ حکمت کی نِشانی ہیں۔

ہر چیز کا میوہ

اگر قرآنی حکمت میں غور سے دیکھا جائے تو یقیناً معلوم ہو جائے گا کہ عالمِ رُوحانیّت میں ہر چیز کا پھُول اور پھل ہے، اور کوئی چیز اس قانُونِ کُلّی سے باہر نہیں (۲۸/۵۷) اور رُوحانی سلطنت کو جنّت (باغ و گلشن) کے اسم سے موسوم کرنے کے معنی بھی یہی ہیں، چُنانچہ ہر چیز کی حسین و جمیل رُوحانی صُورت گویا گُل ہے، ہر شَی کا ذرّۂ رُوح میوہ ہے، اور اس کی حکمت مغز ہے، اس کا مطلب یہ ہُوا کہ عالمِ خیال بمرتبۂ نُورانیّت بہشت کا وہ گلشن ہے، جس میں کائنات و موجُودات کی ہر چیز صِبغۃ اللہ (۲/۱۳۸) کے رنگ میں یا تو پھُول ہے یا پھُول کی طرح رنگین ہے، عالمِ ذرّ وہ باغِ میوہ دار ہے، جہاں تمام چیزوں کی رُوحیں موجُود ہیں، اور وہ ثمرات یعنی میوے کہلاتی ہیں، اور کنزِ عقل وہ خزینۂ الٰہی ہے، جس

ہیں ہر میوۂ بہشت کا مغزِ حکمت موجود ہے۔

اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ جنّت میں کیا کیا نعمتیں ہیں؟ یا پوچھے کہ اس میں کتنی قسم کی نعمتیں ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ بہشت کی بیشمار نعمتیں ایک اعتبار سے دو قسم کی ہیں، پہلی قسم اُن نعمتوں کی ہے جن کو اِنسان پہچانتا ہے، اِس لئے ان کی خواہش کرتا ہے، دُوسری نعمتیں وہ ہیں، جن کا آدمی تصوّر بھی نہیں کر سکتا (۵۰/۳۵) دُوسرے اِعتبار سے جنّت کی چیزیں عقلی، رُوحانی، اور لطیف جسمانی قسم کی ہیں، ان کی بہت سی ذیلی قسمیں ہیں، اس بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ بہشت اور اس کی نعمتوں کی معرفت ضروری ہے، تاکہ صحیح خواہش پیدا ہوسکے، کیونکہ اگر کوئی آدمی ربّ العزّت کی اعلیٰ سے اعلیٰ نعمتوں کا علم نہیں رکھتا اور خواہش و طلب پیدا نہیں کرتا ہے تو قانونِ خزائن (۱۵/۲۱) قانونِ معرفت (۴۷/۶) اور قانونِ چاہت (۵۰/۳۵)[1] کے بموجب وہ چیزیں اس کو نہیں ملیں گی۔

کائنات و موجودات کی ہر چیز درخت کی طرح کام کرتی ہے، اور اُس سے اپنی نوعیّت کا ایک میوہ پیدا ہو جاتا ہے، آسمان کو دیکھئے، کیا سورج، چاند، سیّارے، اور ستارے اِس شجر کے پھل نہیں ہیں؟ پہاڑ جہاں درخت ہے وہاں اس کے میوے جواہرا ور معدنیات ہیں، اگر سمندر درخت نہ ہوتا، تو گوہر (موتی) اِس کے ثمرات نہ ہوتے، ایک اور حکمت یہ ہے کہ زمین

---

[1] ۱۶/۳۱، ۲۵/۱۶، ۳۹/۳۴، ۴۲/۲۲، ۵۰/۳۵

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

درخت ہے، اور اس کے میوے نباتات ہیں، عالمِ نبات درخت ہے، جس کا پھل حیوان کہلاتا ہے، درختِ حیوان کا ثمر انسان ہے، اور دُنیائے انسانیّت کا میوۂ عقل وجان انسانِ کامل ہے، اَب ایک اور نکتہ سُن لیجئے: ایک شریف انسان عہدِ طفولیّت میں غنچۂ ناشگفتہ جیسا محبوب اور پیارا ہوتا ہے، نوجوانی میں اس کی شخصیت گُلِ رعنا کی طرح جاذبِ نظر اور پُرکشش ہوتی ہے، اور جب وہ عمر کی پختگی کو پہنچتا ہے، تو اس وقت وہ عقل ودانش کے اعتبار سے ایک ایسے پاکیزہ وپختہ پھل کے مُشابہ ہوتا ہے، جو خُوشبو، عُمدہ ذائقہ، اور پُرقوّت مغز کے لحاظ سے بہترین ہوتا ہے پس ان مثالوں سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ ہر چیز کا پھل ہے، اور نظامِ کائنات دراصل نظامِ ثمرات ہے، اور بہشت کا راز اسی میں مضمر ہے۔

شُکرگُزاری

اگر اس علمی خدمت کو جہالت ونادانی کے خلاف ایک جہاد قرار دیا جائے تو اس صُورت میں یُوں کہنا حقیقت پر مبنی ہوگا کہ خُدا تعالیٰ اور اس کے رسُولِ برحق صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی نُورانی تائید ونصرت امامِ زمان صلوات اللہ علیہ کے وسیلے سے حاصل ہو سکتی ہے، اور اس میں "خانۂ حکمت" اور "اِدارۂ عارف" کے بہت سے جان نثار مجاہدین سینہ سپر ہو گئے ہیں، آپ انکے حق میں اس طرح دُعا کریں کہ: "خُداوندا! امامِ عالیمقامؑ کے جُملہ مُریدوں اور تمام پاک اِداروں کے صدقے کے طور پر انکو کامیابی اور فتح مندی سے ہمکنار کر دینا! آمین!!"

ہمارے دونوں نامور پریذیڈنٹز فتح علی حبیب اور محمد عبد العزیز اس علمی جہاد میں صفِ اوّل کے مجاہد ہیں یہ صاحبان ہر متعلقہ کام کو، خواہ بڑا ہو یا چھوٹا، بہ نفسِ نفیس انجام دیتے ہیں، وہ چراغِ امامت کے پروانے اور حقیقی علم کے شیدائی ہیں، ان کی دوستی میوۂ بہشت کی طرح بیحد شیرین اور دلنواز ہے، کیونکہ وہ اخلاق و ایمان کی خوبیوں سے آراستہ ہیں، میں دونوں اداروں کے ہر عملدار اور ہر ممبر کو فرشتہ بحدِ قوت سمجھتا ہوں، کہ ان تمام حضرات نے مل کر شرق و غرب میں ایک علمی انقلاب کو جاری و ساری کر دیا ہے۔

میں اس وقت بھی مشرق و مغرب میں پھیلے ہوئے دوستوں اور رفقائے کار کو یاد کرتا ہوں، میرے دل و دماغ اور تصوّر میں زیادہ سے زیادہ وہی عزیزان چھائے ہوتے ہیں، جنھوں نے اپنی گرانقدر خدمات سے ہمارے اداروں کو کامیاب بنا دیا ہے، میں ان سب کا شکر گزار اور ممنون ہوں، اگر یہ بات درست ہے کہ ہر رُوح لاتعداد ذرّات کا مجموعہ ہوا کرتی ہے، تو یہ انتہائی خوشی کی بات ہے، سو میں چاہوں گا کہ میری رُوح کے ذرّات جس کثرت سے بھی ہوں، وہ سب کے سب ہمارے محسنین کے حق میں شکر گزار اور دُعاگو رہیں! اور اُن سے قربان بھی ہو جائیں! آمین!!

نوٹ: صدر فتح علی حبیب اور صدر محمد عبد العزیز کا مشورہ ہے کہ اِس جیسے مقالوں اور کتابوں کو بار بار پڑھا

جائے، تاکہ قرآنی بھیدوں اور رُوحانی معلومات کے ذخیرے میں زبردست اِضافہ ہو سکے۔

خاکپائے اہلِ ایمان

نصیر الدین نصیرؔ ہونزائی

۱۶- جُون ۱۹۸۵ء

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

تخلیق در تخلیق

آفرینش در آفرینش کہیں یا تخلیق در تخلیق یا پیدائش میں پیدائش، بہر حال اس کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کا سلسلۂ فعل، جس میں وہ کُلّی ابتداء وانتہا کے بغیر ہمیشہ ایک چیز سے دُوسری چیز بنانے کے معنی میں پیدائش کے اندر پیدائش کرتا رہتا ہے، اور ہر دانشمند کے نزدیک اس حقیقت کی تحقیق و تصدیق اُس وقت ہو سکتی ہے جبکہ وہ عالمِ شخصی کی تخلیق کو قرآن اور نورِ امامت کی روشنی میں دیکھتا ہے، جیسا کہ حدیثِ شریف میں ارشاد ہُوا ہے :-

لمّا خلق الله العقل استنطقه ثمّ قال له: أقبل فأقبل ثمّ قال له: أدبر فأدبر ثمّ قال: وعزّتي وجلالي ما خلقتُ خلقاً هو أحبّ إليّ منك ولا أكملتك إلاّ فيمن أحِبّ، أمّا إنّي إيّاك آمر، وإيّاك أنهى، وإيّاك أعاقب، وإيّاك أُثيب۔

حضرت ابو جعفرؑ (یعنی حضرت امام باقرؑ) سے روایت ہے کہ: جب اللہ تعالیٰ نے عقل کو پیدا کیا تو وہ بحکمِ خدا بولنے لگی، پھر خدا نے اسے فرمایا:

آگے آ، تو وہ آگے آئی، پھر اسے فرمایا: پیچھے جا، تو وہ پیچھے گئی، پھر ارشاد ہُوا: میری عزّت و جلال کی قسم! کہ مَیں نے کوئی ایسی خلق پیدا نہیں کیا ہے، جو تیرے مقابلے میں مجھ کو زیادہ محبُوب ہو، اور بات یہ ہے کہ مَیں تجھ کو صرف ایسے شخص میں کامل اور مکمّل کر دیتا ہُوں جس سے میں محبّت کرتا ہُوں، ہاں میرے امر و نہی کا خطاب ہمیشہ تجُھ ہی سے ہوتا رہے گا، اور عذاب و ثواب کا تعلّق بھی تجُھ ہی سے ہوگا۔

اِس عالی شان اور پُر حکمت حدیث سے بیک وقت چند حقیقتیں نکھر نکھر کر سامنے آتی ہیں:

۱۔ مقامِ رُوحانیّت کے درجۂ اعلیٰ پر عقل گفتگو کرتی ہے، مگر زبانِ حکمت سے۔

۲۔ عقل نے ترقّی و تنزّل کا ایک بہت بڑا دَور دیکھا ہے۔

۳۔ عقل خُدا کے نزدیک محبُوب ترین مخلوق ہے۔

۴۔ کامل اور مکمّل عقل اُس شخص میں پیدا ہوتی ہے جو خُدا کو پہچانے اور اللہ اُس سے محبّت کرے۔

۵۔ خُداوندی اوامر و نواہی کا اطلاق صرف اور صرف عقل ہی پر ہوتا ہے۔

۶۔ سب سے بڑا عذاب بھی اور سب سے عظیم ثواب بھی عقلی صُورت میں ہیں۔

آپ سب اِس نُورانی تعلیم میں بخُوبی دیکھتے ہیں کہ یہ عالمِ شخصی کی

تخلیق کا ذکر ہے، جو ایک دائمی سلسلہ ہے، جس کو یہاں تخلیق در تخلیق کہا گیا ہے، جس کی مثال انبیاء و أئمہ علیہم السّلام ہیں، چنانچہ جب باری تعالیٰ ایک کامل انسان کے بعد دوسرے کامل انسان کو پیدا کرتا ہے تو وہ تخلیق در تخلیق کرتا ہے اسکے معنی یہ ہوئے کہ خدا تعالیٰ یکے بعد دیگرے شخصی دنیائیں بناتا رہتا ہے، اور ان میں سے ہر ایک میں وہی ساری باتیں واقع ہوتی ہیں، جو مذکورہ حدیث میں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم سب لوگوں کو اپنے آپ (عالمِ شخصی) میں سفر کرنے کی دعوت دیتا ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا ہے:۔

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللَّهُ يُنشِئُ النَّشْأَةَ الْآخِرَةَ (۲۹/۲۰) ان سے کہو کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ اس نے کس طرح خلق کی ابتدا کی، پھر اللہ بارِ دیگر بھی پیدا کرتا ہے۔ اگر ہم اِس پُرحکمت حکم کا مطلب اس ظاہری اور مادّی زمین کی سیر و سیاحت تک محدود کریں، تو اس سے چند سوالات پیدا ہو جاتے ہیں، مثال کے طور پر:۔

۱۔ اگر مانا جائے کہ "الارض" سے یہاں سیارۂ زمین اور "خلق" سے عالمِ ظاہر مُراد ہے، تو اس زمین پر چلنے پھرنے سے یہ راز یا اِس سوال کا جواب کہ: "خُدا نے کس طرح تخلیقِ کائنات کی ابتداء کی؟" کیسے معلوم ہوگا؟

۲۔ اگر کہا جائے کہ یہ حکم عالمِ انسان کے پہلوئے جسمانی کے بارے میں ہے، تو اس صورت میں سیّارۂ زمین کی سیر یا سفر سے خلقتِ آدمؑ

کے بھید کیونکر کھل سکتے ہیں؟ اور کس طرح یقینِ کامل حاصل ہو سکتا ہے کہ خداوند تعالیٰ بارِ دیگر بھی پیدا کرے گا؟

اِس بیان سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ "زمین میں سیر" سے اپنی ذات (یعنی عالمِ شخصی) میں سفر مُراد ہے، جس کا ذکر قرآنِ حکیم میں ۷ + ۷ = ۱۴ بار کے علاوہ بھی ہے، کوئی شک نہیں کہ اِنسانی ذات کی شناخت سے کائنات وموجودات کی شناخت حاصل ہو جاتی ہے، اور اسی کے نتیجے میں حضرتِ ربِّ عزت کی معرفت ہے۔

تخلیق در تخلیق کی ایک اور نمایاں مثال یہ ہے: یخلقکم فی بُطُونِ اُمّھٰتکم خلقًا مّن بعدِ خلقٍ فی ظُلمٰتٍ ثلٰثٍ (۶/۳۹) خُدا تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ میں ایک قسم کی پیدائش کے بعد دُوسری قِسم کی پیدائش سے تین تاریکیوں میں پیدا کرتا ہے۔ یعنی جب اِنسان بحالتِ نُطفہ اپنی ماں کی بچّہ دانی میں ہوتا ہے، تو اُس وقت وہ جسمی، رُوحی، اور عقلی تین قِسم کی تاریکیوں میں ہوتا ہے، ایسی کیفیّت میں اللہ تعالیٰ اس کی تخلیق کے اندر تخلیق کرتے ہوئے اسے جسمانی کمال کی طرف لے جاتا ہے جیسے وہ جوہرِ خاک (سُلالہ) سے نُطفہ بناتا ہے، اُس سے خُونِ بستہ (علقہ) بناتا ہے، اِس سے گوشت کی بوٹی (مضغہ) اس سے ہڈیاں (عظام) پھر ہڈیوں پر گوشت (لحم) چڑھاتا ہے، اور پھر خلق آخر بناتا ہے (۲۳/۱۲-۱۴)

مذکورۂ بالا آیۂ کریمہ بزبانِ حکمت اِنسانوں سے کہہ رہی ہے کہ تم جب اپنی ماؤں کے پیٹ میں تھے اُس وقت جسم، رُوح، اور عقل

تینوں کے انوار سے خالی ہوکر آ گئے تھے، یہ بات بالکل ایسی ہے جیسے حضرتِ آدم علیہ السّلام کا فردوسِ بریں سے فرشِ زمین پر ہبُوط ہُوا تھا، اگر ایسا نہ ہُوا ہوتا تو انسان پر جبکہ شکمِ مادر میں ہوتا ہے ایک ساتھ تین تاریکیوں کا اطلاق نہ ہوتا، کیونکہ قرآنی الفاظ واقعیت وحقیقت کے معنی لئے بغیر نہیں ہوتے۔

انسان کی جس حالت کا نام موت ہے، اور جس کیفیّت کو حیات کہا جاتا ہے اور ان دونوں سے جتنی چیزیں متعلّق ہیں، وہ سب کی سب مل کر ایک مکمّل دائرے کو تشکیل دیتی ہیں، ظاہر ہے کہ دائرے کی بحقیقت کوئی ابتدا و انتہا نہیں، یعنی اس کا کوئی سرا نہیں، لیکن آپ جہاں سے کوئی کام شروع کریں گے وہی جگہ مجازاً مبدا کہلائے گی، کیونکہ اگر حقیقت کی کوئی تعبیر کرنی ہے تو اس کے لئے مجاز سے کام لیا جاتا ہے، اور اس کے بغیر براہِ راست حقیقت کو سمجھ لینا ممکن نہیں۔

آپ اِس آیۂ کریمہ میں خوُب غور کریں: اَلَّذِیٓ اَحۡسَنَ کُلَّ شَیۡءٍ خلقه وَبَدَاَ خلق الانسان من طین (۳۲/۷)۔ جو چیز بھی اُس نے بنائی خوُب ہی بنائی اور اُس نے انسان کی تخلیق کی ابتداء گارے سے کی۔ اس آیۂ مُقدّسہ کی تاویل کرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ اس دُنیا میں اچھّی اور بُری دونوں قسم کی چیزیں ہیں، اور وہ تاویل اس طرح ہے: "خُدا وہ ہے جس نے تخلیق در تخلیق کرتے ہوُئے عالمِ خلق کی ہر چیز کو عالمِ امر کی طرف بلند کیا، اور وہاں اِسے ایک بہترین شکل دے دی، اور حقیقی انسان کی پیدائش

درجۂ مومنی سے شروع کی۔" پس آپ اِس ارشاد میں بغور دیکھ سکتے ہیں کہ ہر آدم سے قبل مومنین موجود تھے۔

ہر کامل اِنسان اپنی ذات میں ایک مکمّل لطیف کائنات (عالمِ شخصی) ہُوا کرتا ہے، اور یہ ایک سلسلہ ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا، جس میں باعتبارِ شخصیّت ہر ایسے عالم کی ابتداء سب سے جُدا اور الگ ہے، بالفاظِ دیگر یہ ابتداء دراصل انفرادی ہے اجتماعی نہیں، اس کا مطلب یہ ہُوا کہ کُلّی طور پر کوئی ابتداء و انتہا نہیں، اور یہ بہت بڑا راز ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کی بادشاہی میں دو قسم کی چیزیں ہُوا کرتی ہیں، ایک ہے شئ ِ مذکور، کہ خدا نے اس کا ذِکر فرمایا ہے، اور دُوسری ہے شئ ِ غیر مذکور، جس کا اُس نے کچھ ذِکر نہیں فرمایا ہے، یہ دونوں مثالیں اِنسان ہی کی ہیں، جیسا کہ سورۂ دہر کے شروع (۱/۷۶) میں ارشاد فرمایا گیا ہے: هَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ یَكُنْ شَیْـًٔا مَّذْكُوْرًا (۱/۷۶) کیا اِنسان پر دہر (زمانِ ناگزرنده) میں سے ایک وقت آیا ہے جس میں وہ کوئی مذکور چیز نہ تھا (یعنی وہ تھا، مگر غیر مذکور) اس کا اشارہ یہ ہے کہ اگرچہ وہ وقت ہنوز نہیں آیا ہے، لیکن ضرور آنے والا ہے، اس ربّانی تعلیم سے تخلیق در تخلیق کے تصوّر پر روشنی پڑتی ہے، اور واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ تخلیق کا خُدائی فعل قدیم ہے، جس کی کوئی ابتداء و انتہا نہیں۔

مذکور اشیاء بھی اور غیر مذکور اشیاء بھی اچھّی اور بُری دو دو

قسم کی ہیں، چنانچہ غیر مذکور چیزوں میں بُری وہ ہیں، جو ایک اعتبار سے کالعدم قرار دی گئی ہیں، مثلاً کافر کو "لَاشَئیَ" قرار دینا، یا مُردہ ٹھہرانا، اور اچھی چیزیں وہ ہیں جو بے مثال ہونے کی وجہ سے غیر مذکور کہلاتی ہیں، جیسے عارفِ کامل کو "فنافی اللہ" کا درجہ دے کر خُدائی میں اس کا ذکر نہ کرنا، حالانکہ کافر بھی اور عارف بھی موجود ہیں، پس دہر کی مقاربت و مناسبت سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں اِنسان کا غیر مذکور چیز ہونا قابلِ ستائش بات ہے، کیونکہ اس حال میں اِنسان کی حقیقت ہمیشہ اصل سے واصل رہنے کا ثبوت مل جاتا ہے۔

جب اللہ تعالیٰ جو واحد و قہّار (۴۰/۱۶) ہے عالمِ شخصی میں انقلاب لاکر بکھرے ہوئے مکان و زمان کو دستِ قدرت میں سمیٹ لیتا ہے (۳۹/۶۷) اور حقیقتِ حقائق میں جُملہ حقیقتوں کا مظاہرہ فرماتا ہے تو اس میں نہ صرف دہر ہی سامنے ہوتا ہے، بلکہ ازل اور ابد کا تصوّر بھی ایک ہی ہوتا ہے، کیونکہ وہاں جو سب سے بُنیادی، سب سے آخری اور سب سے عظیم خزانہ ہے، اس میں تمام حقائق و معارف محدُود و موجُود ہیں، یہ گنج اصل و اساس کی حیثیت اس لئے رکھتا ہے کہ اسی سے کائناتِ ظاہر و باطن کی ہر ہر چیز پیدا کی گئی ہے، اور آخری اس معنیٰ میں ہے کہ جُملہ اشیائے مکانی و زمانی کا نچوڑ یعنی جوہر یہی ہے، اس خزانۂ بے بہا کا ایک خاص نام مُلکِ خُدا (یعنی خُدا کی بادشاہی) ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:-

تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ

شیٍٔ قدیر (٦٧/١) وہ (خُدا) نہایت بابرکت ہے جس کے ہاتھ میں سلطنت ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس میں بطریقِ اشارہ یہ فرمایا گیا ہے کہ رُوحانیّت کے جس مقام پر خُدا کے ہاتھ میں مُلک و ملکوت (یعنی گنجِ گوہر) ہے، وہیں تمام علمی و عرفانی برکتیں اور قُدرتیں مرکوز ہو جاتی ہیں، اس سے ظاہر ہے کہ نُورِ عقل جو حقیقتِ حقائق ہے، اُس میں ہر اعلیٰ سے اعلیٰ اور ہر مُشکل سے مُشکل تصوّر کی نمائندگی موجُود ہے، اس لئے کہ وہ قلمِ قُدرت ہے، کتابِ مکنون، سرچشمۂ نُور، کوہِ طور، حجرِ مکرّم، اور معدنِ علم و حکمت ہے۔

تخلیق در تخلیق کی ایک اور روشن مثال یہ ہے کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ کے حُکم سے کوئی کامل انسان پیدا ہو جاتا ہے، پھر وقت آنے پر اس کا رُوحانی جنم ہوتا ہے، پھر وہ جیتے جی رُوحانی موت کے مرحلے سے گُزر جاتا ہے، اور آخر میں جب اس کا اِنبعاث ہو جاتا ہے، تو تب وہ اِس آیۂ کریمہ کا مِصداق بن جاتا ہے، وہ ارشاد یہ ہے: اِنّہٗ یَبدَؤُ الخلق ثمّ یعیدہٗ (١٠/٤) بیشک پیدائش کی ابتداء وہی کرتا ہے پھر وہی اس کا اعادہ کرتا ہے۔ یہاں اِنسانِ کامل کا ذکر اس لئے ضروری ہُوا کہ صرف وہی مُبارک ہستی ظاہراً و باطناً خُداوند تعالیٰ کی آخری اور مکمّل تخلیق کا نمونہ ہے، جیسے خُدا تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السّلام کو کما حقّہٗ پیدا کیا، اور سلسلۂ انبیاء و ائمّہ علیہم السّلام میں اپنی پاک و پُرحکمت عادت (سُنّت ٣٣/٦٢، ٤٠/٨٥) کو دُہراتا رہا۔

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

آپ یہ کلیدی حکمت ہرگز نہ بھولیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے جیسے صفاتی نام ہیں اور ان ناموں کے مطابق جیسا اس کا کام ہے، وہ سب کچھ اس کی سُنّتِ عالیہ میں داخل ہے، اور خُدا کی پاک سنّت وہ ہے، جو اس کے خاص بندوں یعنی کامل اِنسانوں میں ہوگُزری ہے اور وہ کسی تبدیلی کے بغیر ہمیشہ جاری ہے (۳۳/۶۲، ۳۵/۴۳) پس اس کے معنی یہ ہُوئے کہ خُداوندِ تعالیٰ کے فعلِ تخلیق کی نہ کوئی ابتداء ہے اور نہ کوئی انتہا، بلکہ وہ ہمیشہ تخلیق در تخلیق کرتا رہتا ہے اور اسی فعلِ قدرت سے خُدائی رحمت و علم کے سمندر ہر وقت موجزن رہتے ہیں۔

خانۂ حکمت   اِدارۂ عارف

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

ذرّۂ خاک:

نصیر الدّین نصیر ہونزائی

۲۷- جنوری ۱۹۸۵ء

عبادت میں مخفی خزانے

قرآنِ حکیم میں لفظِ "عبادت" کے مختلف صیغوں کا مجموعہ ۲۷۵ ہے، ان الفاظ سے متعلق آیاتِ کریمہ میں براہِ راست بھی اور بالواسطہ بھی عبادت و بندگی کا ذکر فرمایا گیا ہے، صلوٰۃ، سجدہ، ذکر، تسبیح، دُعا وغیرہ جیسے لفظوں میں جس طرح اللہ تعالیٰ کی بندگی کا بیان آیا ہے، وہ اس کے علاوہ ہے، غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کا موضوع جتنا اہم ہے اتنا وسیع و عمیق بھی ہے، کیونکہ جنّات اور انسانوں کی تخلیق کا مقصد عبادت ہی ہے، جیسا کہ پروردگارِ عالم کا فرمان ہے:-

۱- وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (۵۱/۵۶) اور میں نے جنّوں اور آدمیوں کو اسی غرض سے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔ عبادت کی ارتقائی منزلیں ہُوا کرتی ہیں، چنانچہ وہ شروع شروع میں معمولی نوعیّت کی ہوتی ہے، مگر یہ رفتہ رفتہ اپنے عروج اور درجۂ کمال پر جا پہنچتی ہے، جبکہ ہر طرح کے شرک و شُبہ سے پاک اور خُداشناسی کے نُور سے منوّر ہوتی ہے، پیغمبرِ خُدا صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم

اور أئمّۂ ھُدیٰ صلوات اللہ علیھم نے ہمیشہ ایسی کامیاب عبادت وبندگی کی عملی تعلیم دی ہے، اور اسی کو پیغمبرانہ یا عارفانہ عبادت کہتے ہیں، اور آنحضرتؐ کی حقیقی پیروی یعنی اُسوۂ حسنہ (۳۳/۲۱) اسی معنیٰ میں ہے۔

۲۔ قرآنِ حکیم میں جگہ جگہ عبادت کے ذِکر کے ساتھ ساتھ معرفتِ توحید کے بھی قابلِ فہم اشارے موجود ہیں، جیسے مذکورۂ بالا آیۂ مُقدّسہ کا واضح اشارہ یہ ہے کہ جِنّ وانس کا کوئی فرد معبود نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ مخلوق ہے خالق نہیں، وہ عبادت کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے، اسے عَبدؔ اور عابد ہونا ہے، اور معبُود ہونا نہیں، اور اس کو خُدا کی معرفت اُس وقت حاصل ہوگی، جبکہ وہ اپنی رُوحانی تخلیق کا مُشاہدہ اور مطالعہ کر لیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس آیۂ مُبارکہ میں حقیقی عبادت سے پہلے رُوحانی تخلیق کا ذِکر ہے، کیونکہ خَلَقْتُ (میں نے پیدا کیا) کے اِس خُدائی فعل میں تخلیق کے تمام جسمانی اور رُوحانی مراحل کا ذِکر فرمایا گیا ہے۔

۳۔ خُداشناسی اور بندگی (عبادت) ایک ایسا ضروری اور مُشکل امر ہے کہ لوگ نہ تو اس کی اہمیّت کو جانتے تھے اور نہ ہی اسے بجالا سکتے تھے، لہٰذا خُداوندِ عالم نے اِس سلسلے میں لوگوں کو تعلیم دینے کی خاطر پیغمبروں کو مبعوث فرمایا، جیسا کہ ارشاد ہے: ولقد بعثنا فی کُلِّ اُمّۃٍ رسولاً اَنِ اعْبدوا اللّٰہَ وَاجْتنبوا الطّاغوت (۱۶/۳۶) اور ہم نے تو ہر اُمّت میں ایک (نہ ایک) رسُول اس بات کے لئے ضرور بھیجا کہ لوگو خُدا کی عبادت کرو اور بُت (کی عبادت)

سے بچے رہو۔ طاغوت کے معنی سرکش، شیطان، اور بُت کے درمیان مشترک ہیں، چنانچہ اس آیۂ کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ تُم بالآخر خُداشناسی اور علمِ توحید کی روشنی میں عبادت کرو، تاکہ تُم سرکش شیطان اور بُت کی پرستش سے نجات پاؤ گے۔

۴۔ شیطان سے بچ کر مُوحّدانہ عبادت کرنے کے لئے لوگوں سے جیساکہ فرمایا گیا ہے، اگر اُنھوں نے اس کے مطابق عمل نہ کیا تو اس کی پرستش اس طرح ہوگی (ترجمہ آیۂ کریمہ) : اے اولادِ آدمؑ کیا میں نے تم سے یہ عہد نہیں لیا تھا کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا وہ یقیناً تمھارا کھُلم کھُلا دشمن ہے اور یہ کہ صرف میری عبادت کرنا یہی سیدھی راہ ہے (۳۶ / ۶۰-۶۱) آپ بخوبی جانتے ہیں کہ دُنیا میں کوئی ایسا گروہ یا فرد نہیں ہوسکتا، جو شیطان کو جان پہچان کر اس کی عبادت کرتا ہو، مگر بات یہ ہے کہ جہالت و نادانی کی وجہ سے اکثر لوگ راہِ حق سے ہٹ کر شیطان کے پیچھے چلتے ہیں، اور یہی شیطان کی پیروی درحقیقت شیطان کی عبادت کہلاتی ہے۔

۵۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خُدا تعالیٰ کی ہر اطاعت عبادت ہے، اور اللہ کی وہ اطاعت بھی یقیناً عبادت ہے، جو رسُولؐ اور صاحبانِ امرؑ کے توسّط سے بجالائی جاتی ہے، جیساکہ ارشادِ خُداوندی ہے :
اے ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو اور پیغمبرؐ کی اطاعت کرو اور صاحبانِ امر کی اِطاعت کرو جو تُم میں سے ہیں (۴ / ۵۹) اِس ربّانی تعلیم کی روشنی میں دیکھنے سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ رسُولِ اکرمؐ اور امامِ زمانؑ

کی فرمانبرداری دو طرح سے خدائے واحد کی عبادت قرار پاتی ہے، اوّل یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ تم رسولؐ اور امر والوں کی اطاعت کرو، اب اس خدائی حکم کی تعمیل عبادت ہوگی، دوم یہ کہ اولوالامر کی اطاعت رسولؐ کی اطاعت ہے، رسولؐ کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے، اور اللہ کی اطاعت عبادت ہے۔

۶۔ عبادت کے دوران چہرۂ جان کو خدا تعالیٰ کی طرف قائم رکھنے اور دین کو شرک کی آمیزش سے خالص و پاک کر کے اسی کو پکارنے کے لئے یوں حکم دیا گیا ہے: واقیموا وجوھکم عند کلّ مسجدٍ وادعوہُ مخلصین لہ الدّین (۷/۲۹) اور یہ کہ تم ہر عبادت کے وقت اپنی توجّہ قائم رکھا کرو اور اسی کو پکارو دین کو اُس کے لئے خاص رکھ کر۔

۷۔ اللہ تعالیٰ کی جو زمین بے پناہ وسیع ہے، وہ زمینِ رُوحانیّت ہے (۴/۹۷، ۲۹/۵۶، ۳۹/۱۰) چنانچہ ارشاد ہے: یٰعبادی الّذین اٰمنوآ انّ ارضی واسعۃٌ فایّای فاعبدون (۲۹/۵۶) اے میرے خاص بندو جو کما حقّہٗ ایمان لائے ہو یقیناً میری زمین (رُوحانیّت) بہت وسیع ہے سو خالص میری ہی عبادت کرو (تاکہ تم کو اُس زمین میں خلافت عطا کی جائے)۔ جیساکہ ارشاد ہوا ہے: تم (مسلمین و مؤمنین) میں سے جن لوگوں نے ایمان لایا جیساکہ اس کا حق ہے اور اچھے اچھے کام کئے ان سے خدا نے وعدہ کیا ہے کہ ان کو (رُوحانی) زمین میں ضرور خلیفہ بنائے گا

جس طرح اُن لوگوں کو خلیفہ بنایا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں (۲۴/۵۵) مذکورہ دونوں آیتوں میں ایسے مومنین کا ذکر فرمایا گیا ہے، جو خُدا شناس اور مُوحّد ہونے کی بدولت اللہ تعالیٰ کے اِنعامات کے مستحق قرار پاتے ہیں۔

۸۔ خُدا شناسی، توحید، اور کسی آمیزش کے بغیر خالص عبادت کا ایک بڑا اہم قرآنی موضوع "اِخلاص" ہے، جس کا مطلب ہے تصوّرِ توحید کو ہر قسم کے شرک کی آمیزش سے خالص اور پاک و پاکیزہ کرنا، اس عظیم الشّان موضوع سے متعلق پُر حکمت الفاظ میں سے ایک لفظ "مُخلَصِین" ہے، جو قرآنِ کریم میں آٹھ بار آیا ہے، جس کے وسیع تر معنی ہیں خُدا کے ایسے بندے جو معرفت اور خالص عبادت کے وسیلے سے برگزیدہ کئے گئے ہیں، جیسا کہ ارشاد ہے:۔

قال فبعزّتك لاُغوينّهم اجمعين ـــ اِلّا عبادك منهم المُخلَصِين (۳۸/۸۲-۸۳) ابلیس نے کہا تیری عزّت کی قسم، میں ان سب لوگوں کو بہکا کر رہوں گا بجز تیرے اُن بندوں کے جنھیں تُو نے خالِص کر لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے خالص و برگزیدہ بندے سب سے پہلے انبیاء و أئمّہ علیھم السّلام ہیں اور پھر ان کی پیروی کرنے والے مومنین ہیں، جو دامنِ امامت کے نیچے ہر طرح سے محفوظ و سلامت ہیں، اور نورِ ہدایت کی روشنی میں جادۂ مُستقیم پر گامزن ہیں۔ لہٰذا شیطان ان کو گمراہ نہیں کر سکتا۔

۹۔ سورۂ صافات میں فرمایا گیا ہے:..... مگر خُدا کے برگزیدہ

بندے (اہلِ نجات ہیں) ان کے واسطے دانستہ رزق ہے، ہر قسم کے میوے اور وہ لوگ بڑی عزت سے نعمت کے باغوں میں ایک دُوسرے کے آمنے سامنے تخت نشین ہوں گے (۳۷: ۴۰-۴۴) اس نُورانی تعلیم میں بھی اخلاص کے شاندار نتائج کا ذکر ہے، یعنی خداشناس اور مُوحّد لوگوں کو بہشت کی لازوال وابدی نعمتیں حاصل ہوں گی، اس سلسلے میں "رزقِ معلوم" یعنی ایسا رزق (روزی) جو پہلے سے جانا پہچانا ہُوا ہے، بڑا اہم مسئلہ ہے، کیونکہ اگر ہم اس سے مادّی قسم کی نعمت مُراد لیتے ہیں، تو پھر اس خیال سے ایک عجیب نتیجہ نکلے گا، وہ یہ کہ بہشت کی نعمتیں صرف ایسے لوگوں کو ملیں گی، جو اس دُنیا میں مادّی طور بڑی آسائش میں رہتے ہوں، کیونکہ ظاہری نعمتوں کو وہی لوگ بہتر جانتے ہیں، لیکن ایسا نہیں ہے، بلکہ یہ حقیقی نعمت ہے جو عقل کے لئے ہے، اور جو رُوح کے لئے ہے، اور یہی وہ رزق ہے جو اہلِ حقیقت کو دُنیا ہی سے معلوم ہے، اگرچہ دُنیا میں یہ نعمت جُزوی طور پر ہے اور آخرت میں کُلّی طور پر۔

رزقِ معلوم عبادت کی چاشنی ہے، ثمرۂ عشقِ مولا ہے، اور نُورانی علم، اور اِس سے یہ سوال اُٹھتا ہے کہ آیا بہشت میں اہلِ بہشت عبادت کرتے ہیں؟ اِس کا جواب اِثبات میں ہے، مگر وہاں عبادت بڑی آسانی، نُورانیّت، زبردست لذّت اور کشفِ اسرار کے ساتھ ہوگی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

(وہ زمینِ رُوحانیّت میں منصبِ خلافت پر فائز ہو جانے کے

ساتھ) میری خالص عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گے (۲۴/۵۵)۔ یہاں شرک کا مطلب شرکِ خفی ہے، یعنی عبادت میں غیرِ خدا کے خیال یا وسوسے کو دل میں آنے دینا، جیسے سورۂ عنکبوت (۲۹/۶۵) میں کچھ اہلِ ایمان کے بارے میں مثال دی گئی ہے کہ وہ لوگ جب کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو اللہ کو کسی شرک کے بغیر پکارتے ہیں، اور جب ان کو خدا نجات دے کر خشکی کی طرف لے آتا ہے، تو پھر وہ فوراً ہی شرک کرنے لگتے ہیں (۲۹/۶۵)۔ چنانچہ یہ شرک جو خیالاتِ باطل کی شکل میں ہے، جو بہت سے مومنین میں بھی ہو سکتا ہے، جس سے عبادت کو ہر بار نقصان پہنچتا ہے وہ اہلِ جنّت کے دِل میں نہیں ہوگا، لہٰذا وہ لوگ بہشت میں ہر قسم کے شرک سے خالص عبادت کریں گے۔

۱۰۔ بہشت کی عبادت یقیناً معجزاتی ہے، جس کا نمونہ اِس دُنیا میں پیغمبرانہ اور اولیائی عبادت ہے، جیسا کہ قرآنِ پاک کا حُکم ہے: درحقیقت تُم لوگوں کے لئے اللہ کے رسولؐ میں ایک بہترین نمونہ تھا، ہر اس شخص کیلئے جو اللہ اور روزِ آخر (یعنی امامؑ) سے اُمید وابستہ کرتا ہو اور کثرت سے ذکرِ الٰہی کرے (۳۳/۲۱)۔ اس خُدائی تعلیم کا واضح مطلب یہ ہے کہ جو لوگ خُدا، رسُولؐ، اور صاحبِ امرؑ کی اطاعت کرتے ہوئے دائم الذّکر ہو جاتے ہیں، اُن پر پیغمبرِ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے نمونۂ عمل کا روشن ہو جانا یقینی ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو آنحضرتؐ کے اُسوۂ حسنہ کی پیروی کی دعوت نہ دی جاتی۔

۱۱۔ کوئی شک نہیں کہ شرکِ جلی اور شرکِ خفی سے پاک عبادت میں مخفی خزانے ہُوا کرتے ہیں، جن میں جیسے لعل و گہر ہوتے ہیں، ان کی قدر و قیمت رُوحانی، عقلی، علمی، اور عرفانی ہوتی ہے، اور یہاں یہ بھی یاد رہے کہ خُدا تعالیٰ، رسُولِ پاکؐ، اور امامِ برحقؑ گنجہائے مخفی ہیں۔

۱۲۔ معرفت اور عبادت کے درجات ایک دُوسرے سے وابستہ ہیں، اور معرفت کا دُوسرا نام یقین ہے، چُنانچہ یقین یعنی معرفت کی وجہ سے عبادت کے تین بڑے مرحلے ہیں، عبادت بمرتبۂ علم الیقین، عبادت بمرتبۂ عین الیقین، اور عبادت بمرتبۂ حقّ الیقین، اور اسی طرح عبادت مرحلۂ آخر تک ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا ہے: اور اپنے ربّ کی بندگی کرتے رہو یہاں تک کہ حقّ الیقین (کی منزل) آئے (۱۵/۹۹) یہ مُکلّفانہ عبادت کی آخری حدّ ہے، مگر جہاں یہ میوۂ بہشت کی حیثیت سے ہے، وہاں اس سے ہمیشہ ہمیشہ نوُر و سرور حاصل ہوتا رہتا ہے۔

خانۂ حکمت　　　　ادارۂ عارف

نصیرِ حقیر

۲۸۔ دسمبر ۱۹۸۴ء

خوفِ خدا اور خوفِ بے جا

خوف ذی حیات مخلوق کی ایک صلاحیّت ہے جو حیوان میں خُود حفاظتی کی غرض سے ہے، مگر انسان میں اِس کے ہونے کا خاص مقصد خُدا ہی سے ڈرنا ہے، چُنانچہ اگر انسانی خوف عملاً اسی مقصدِ اعلیٰ کے مطابق ہے تو بجا ہے، ورنہ بیجا (بے موقع، نامناسب) ہے، جیسے سورۂ احزاب (۳۳/۳۹) میں فرمایا گیا ہے کہ حضرت انبیاء علیہم السّلام اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہ ڈرتے تھے، کیونکہ خالق و مالک وہی ہے اور دُوسرے سب مخلوق و مملوک ہیں۔

جو خوف جانوروں میں ہوتا ہے، اس کی عقلی اور علمی ترقّی ناممکن ہے، کیونکہ جانور عقل جیسی روشنی سے محروم ہیں، اس لئے وہ جب بھی ڈرتے ہیں تو قوّتِ واہمہ کے زیرِ اثر ڈرتے ہیں، مگر جو خوف اِنسان میں ہے، وہ عقل کی ہم سایگی کی وجہ سے ترقّی پذیر ہے، لٰہذا یہاں اس کا معیار بلند سے بلند تر ہو سکتا ہے، جس کی ایک مثال یہ ہے ایک چھوٹا سا بچّہ شروع شروع میں غیر موجُود وہمی چیزوں کے نام سے ڈر جاتا ہے، لیکن وقت کے

ساتھ جیسی جیسی اس کو تعلیم ملتی رہتی ہے، اس کے مطابق خوف پہلے سے کہیں زیادہ درست کام کرنے لگتا ہے، یہی حال دین کے معاملے میں بھی کہ کہ کامل انسانوں کو چھوڑ کر باقی سب لوگ خوفِ خدا کے سلسلے میں بچّوں کی طرح ہیں، اور یہی سبب ہے کہ قرآنِ حکیم تمام لوگوں کو خدا سے ڈرنے کی تعلیم دیتا ہے اور تاکید کرتا ہے کہ اللہ سے ڈرا کریں جیسا کہ بحقیقت اُس سے ڈرنا چاہیئے، چنانچہ ارشاد فرمایا گیا ہے:۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ (۳/۱۰۲)

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو جیسا کہ اُس سے ڈرنے کا حق ہے۔

اِس حکم میں دو اہم مفہوم ہیں، اوّل یہ کہ کسی دُوسرے سے نہیں بلکہ صرف خدا ہی سے ڈرنا، دُوسرا یہ کہ خدا سے اس طرح ڈرنا، جس طرح کہ حقیقت میں اُس سے ڈرنے کی کیفیّت ہے، اور اِس بلند ترین معیار کے بارے میں ارشاد ہُوا ہے:۔

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا (۳۵/۲۸) سوائے اس کے نہیں کہ خدا کے بندوں میں سے علم والے ہی اُس سے ڈرتے ہیں۔

بقول حضرت امام جعفر الصّادق علیہ السّلام علماء سے أئمّۂ طاہرین عؑ مُراد ہیں، کیونکہ یہی حضرات نُورِ علم کی روشنی میں بحقیقت اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں، اور بدرجۂ اعلیٰ خوفِ خدا کی صِفت سے مُتّصف ہیں، یعنی تقوٰی (خوفِ خدا) اِنسانِ کامل کے اوصافِ کمال میں سے ہے، جو اس کی ذات میں بمرتبۂ علمِ لُدنّی موجود ہوتا ہے، اس کا مطلب یہ ہُوا کہ تقویٰ کا معیارِ

اعلیٰ حقیقی علم ہے۔

اگرچہ لفظِ خوف کا اطلاق حضراتِ انبیاء و أئمہؑ علیہم السّلام، اور عوام النّاس کے علاوہ حیوانوں پر بھی ہو جاتا ہے، لیکن جیسا کہ اُوپر بتایا گیا اس میں آسمان زمین کا فرق ہے، کیونکہ خوف کے بہت سے درجات ہیں، جن میں سب سے اُوپر صرف خُدا ہی کا خوف ہے، اور اس میں دُنیاوی خوف و ہراس کے برعکس حقیقی امن و سکُون کی غیر فانی دولت موجُود ہے، کیونکہ " خُدا سے ڈرنا " دراصل خُدا کو یاد کرنا ہے، اور خُدا کی یاد سے دِلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے (۲۸/۱۳)

دانشمندوں پر یہ حقیقت روشن ہے کہ خوفِ خُدا میں علم و حکمت کے خزانے پوشیدہ ہیں، اور خوفِ دُنیا میں مایُوسی اور لاچاری کے سوا کچھ بھی نہیں، اللہ تعالیٰ کے خوف کی بدولت انسان کی زندگی رحمتوں اور برکتوں سے مملو ہو جاتی ہے، اور اگر کوئی شخص بادشاہِ حقیقی سے نہیں ڈرتا، تو اس کی یہ سزا مقرّر ہے کہ وہ ہمیشہ خوفِ غیر میں مُبتلا رہتا ہے اور اس کی عمر تلخیوں میں گزُرتی ہے۔

یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ خوفِ الٰہی اور خوفِ دُنیاوی کیفیت، تاثیر اور نتیجہ کے اعتبار سے ایک جیسے ہوں، اور خاص کر اُس خوفِ خُدا کی بات کریں، جو اللہ کے دوستوں کے دِل میں ہوتا ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا ہے: اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۱۰/۶۲) یاد رکھو خُدا کے دوستوں پر نہ کوئی خوف ہے اور

نہ کوئی غم۔ اللہ تعالیٰ کے دوستوں میں سب سے اوّل انبیاء و ائمہ صلوات اللہ علیہم ہیں، جن کے مبارک دلوں میں جس طرح خوفِ خدا یا تقویٰ ہُوا کرتا ہے، وہ اگر ظاہری اور دُنیاوی خوف جیسا ہوتا، تو پروردگارِ عالم مذکورہ آیۂ مبارکہ میں انکی ذاتِ شریف سے ایسے خوف و غم کی نفی نہ فرماتا، اس روشن دلیل سے یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے کہ خوفِ مولا اور خوفِ دُنیا ایک دُوسرے کے برعکس ہیں، کیونکہ جب خُدا بے مثل ہے تو اُس سے ڈرنا کسی مخلوق سے ڈرنے کی طرح کیونکر ہو سکتا ہے۔

اب یہاں یہ سوال کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جب انسان میں درخت، حیوان، انسان تینوں کی رُوحیں جمع ہیں، تو پھر بتائیے کہ دُنیاوی خوف کس طرح رُوح میں ہے، اور خُدائی خوف کس رُوح میں؟ اس کا یقینی جواب یہ ہے کہ نباتات میں خوف و ہراس کی کوئی علامت نہیں، مگر حیوانات میں خوف موجود ہے، لہٰذا ظاہری اور جسمانی خوف کا سبب رُوحِ حیوانی ہے، اور اب رہا خُدا کا خوف تو اس کا وسیلہ عقل ہے، جو رُوحِ انسانی کا شعلہ ہے، اسی لئے قرآنِ حکیم نے فرمایا کہ خوفِ خُدا کا خاص تعلق ربّانی عالموں سے ہے (۳۵/۲۸)

قرآنِ پاک نے یہ بھی بتا دیا کہ خوفِ بیجا شیطان کا حربہ ہے، جیسا کہ فرمانِ خداوندی ہے: سوائے اس کے نہیں کہ یہ شیطان ہے جو اپنے دوستوں سے تم کو ڈراتا ہے (۳/۱۷۵) اس میں کوئی سوال نہیں کہ یہ خوف نفسِ حیوانی میں ہے، یا شیطان سے؟ جبکہ شیطان نفسِ امّارہ کے توسّط

سے کام کرتا ہے، یا یُوں کہا جاتے کہ شیطان کا ایک بھیس نفسِ حیوانی ہے۔

خُدائے بُزرگ و برتر نے اپنی عزیز کتاب میں جگہ جگہ مسلمین و مومنین کو یہ ہدایت دی ہے کہ وہ دُشمنانِ اسلام کی کثرتِ ظاہری سے ہرگز خائف نہ ہو جائیں، جیساکہ وہ جَلّ شانہٗ، عالی ہمّت اور با بصیرت مومنین کی ترجمانی کرتے ہُوئے ارشاد فرماتا ہے: حسبنا اللہ ونعم الوکیل (۳، ۱۷۳) ہم کو خُدا تعالیٰ کافی ہے اور وہی سب کام سپُرد کر دینے کے لئے اچھّا ہے۔

"خوفِ بے جا" جیسے مرض کی قرآنی دوا ایک تو خُدا کی یاد ہے جو کثرت سے ہونی چاہیئے، اور دُوسری حقیقی علم کی روشنی ہے، جس سے اِس بیماری کا مُستقل علاج ہو جاتا ہے، اِس کا مطلب یہ ہُوا کہ اللہ کے ذِکر سے جنّی شیطان بھاگ جاتا ہے، اور علمِ یقین سے اِنسی شیطان شکست کھاتا ہے، جس طرح شیطان کے پتھراؤ سے بچنے کے لئے خُدا تعالیٰ کے قرب وحضور میں جانے کی تعلیم دی گئی ہے، جس کی تاویل ہے امامِ زمان صلوات اللہ علیہ وسلامہ کے نُورانی علم میں خُود کو محفوظ کر لینا۔

ارشادِ خُداوندی ہے: وَمَنۡ یَّعۡشُ عَنۡ ذِکۡرِ الرَّحۡمٰنِ نُقَیِّضۡ لَہٗ شَیۡطٰنًا فَھُوَلَہٗ قرین (۴۳، ۳۶) اور جو شخص اللہ کی یاد سے اندھا بن جاتے ہم اس کے لئے ایک شیطان مقرّر کر دیتے ہیں سو وہ اس کے ساتھ رہتا ہے۔ امامِ اقدس و اطہرؑ خُدا تعالیٰ کا زندہ اسمِ اعظم اور نُورانیّت سے بھرپُور ذکرِ پاک ہیں، کہ آپؑ ہی کے وسیلے سے یادِ الٰہی کا نور حاصل ہو جاتا ہے، اور شیطان کے چنگل سے

سے مومنین کو چھٹکارا مل جاتا ہے، کیونکہ امامِ زمان علیہ السّلام بمرتبۂ علیؑ وقت علم و حکمت کے باب (دروازہ) ہوا کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ خوفِ خدا یعنی تقویٰ کے ظاہراً و باطناً کئی مدارج ہیں، چنانچہ یہ مقام روحانیّت اور درجۂ عقل پر علمی ظہورات و معجزات کی شکل میں ہے، جیسے سورۂ فتح (۴۸/۲۶) میں ہے کہ خدا تعالیٰ نے "کلمۂ تقویٰ" مومنین سے وابستہ (لازم) کر دیا، سو تقویٰ کا کلمہ جو ایک بہت بڑا اسم ہے وہ روحانیّت کا ایک علمی اور عملی معجزہ بھی ہے اور خود کار ذکرِ الٰہی بھی ہے، اور ان تمام معنوں میں اللہ تعالیٰ اپنے اس احسانِ عظیم کا ذکر فرماتا ہے کہ اس نے کچھ مومنین کو کلمۂ تقویٰ کا روحانی معجزہ دکھایا، جس میں تطہیر و تزکیہ کا ایک عزرائیلی راز پوشیدہ ہے۔

پروردگارِ عالم کا پُرحکمت ارشاد ہے: اگر ہم اِس قرآن کو پہاڑ پر نازل کرتے تو (اے مخاطب) تُو اس کو دیکھتا کہ خدا کے خوف سے دب جاتا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا، اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سوچیں (۵۹/۲۱) جب اللہ جلّ شانہٗ نے طُور پر تجلّی فرمائی تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا (۷/۱۴۳) یہ تجلّی خالی از معنی نہ تھی، بلکہ وہ بصورتِ نورِ آسمانی کتاب تھی، یعنی توراۃ، اور یہ انتہائی عظیم واقعہ دو دفعہ پیش آیا، پہلی بار کوہِ روح پر، اور دوسری بار کوہِ عقل پر، اور خوفِ خدا کے یہی معجزے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی روحانیّت میں بھی ہوئے کہ پہلے خداوندِ عالم نے حضورِ اکرمؐ کے کوہِ روح پر تجلّی فرمائی، جس میں قرآن

پاک کا رُوحانی ظہور ہُوا، اس کے بعد خُدائے برتر نے آپؑ کے کوہِ عقل پر تجلّی کی، اور وہاں نُورِ عقل میں قرآنِ حکیم کے ظہُورات ہُوئے، دونوں پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گئے تھے۔

پہاڑ کی کئی تاویلیں ہیں، ان میں سے ایک تاویل کوہِ رُوح ہے، اور دُوسری کوہِ عقل، ان دونوں کے ریزہ ریزہ ہو جانے میں فرق ہے، کیونکہ رُوح نے بیک وقت لاتعداد ذرّات ہیں، مگر عقل نمونۂ وحدت ہے، لہٰذا وہ عالمِ شخصی میں صرف ایک ہی گوہر ہے، تاہم جس طرح یکے بعد دیگرے اس کے علمی ظہورات کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اس کے پیشِ نظر وہ بھی بے شمار عقلی ذرّات کی نمائندگی کرتا ہے۔

یہ جو کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے دوبارہ تجلّی فرمائی تھی، اس کا ثبوت رُوح اور عقل کے دو پہاڑ ہیں، نیز یہ ہے کہ ذاتِ واحد کے سوا جو کچھ ہے، وہ سب سے پہلے دوئی رکھتا ہے، چنانچہ اگر مانا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی بہت سی تجلّیات ہیں، تو اصولاً یہ کہنا پڑے گا کہ اساسی تجلّیاں دو ہیں، اور یہ بھی یاد رہے کہ سب سے پہلے قانونِ وحدت ہے، اس کے بعد قانونِ تثنیہ (دُوئی) اور آخر میں قانونِ کثرت ہے، توحید کا تصوّر مسلّم ہے، اور کثرت بھی عیاں ہے، لہٰذا قانون دوئی کے بارے میں قرآنِ حکیم میں دیکھئے:۔

۱۔ حضرت نوح علیہ السّلام کی کشتی رُوحانیّت میں نہ صرف جانور بلکہ جُملہ اشیاء کی قسموں میں سے جُفت جُفت یعنی دو دو لی گئی تھیں

(۱۱/۴۰، ۲۳/۲۷)

۲۔ خالقِ برحق نے کُلّ چیزوں کے دو دو جوڑے بنائے ہیں، اور کوئی چیز اس قانون سے باہر نہیں (۵۱/۴۹، ۳۶/۳۶)

۳۔ بہشت کے سب پھلوں کے جوڑے جوڑے ہیں، اور کوئی پھل اکیلا نہیں (۵۵/۵۲، ۱۳/۳)

۴۔ یہ بنیادی اور آخری حقائق دو دو ہیں: عرش وکُرسی، قلم ولوح عقلِ کُل ونفسِ کُلّ، آدم وحوّا، آخرت ودُنیا، آسمان وزمین، خیر وشر، ناطق واساس، امام وحُجّت، پدر ومادر، دن رات، عقل ورُوح، وغیرہ وغیرہ۔

قرآنِ کریم تین چیزوں کی تعلیم ایک ہی شان سے اور ایک ہی نہج پہ دیتا ہے: بلاشرکتِ غیرے صرف خُدا ہی کی عبادت کرنا (۱/۴، ۲۹/۵۶) صرف خُدا ہی سے مدد کے لئے درخواست کرنا (۱/۴) اور صرف اسی سے ڈرنا (۲/۴۰، ۲/۴۱) (۱۶/۵۱)، اس کی وجہ یہ ہے کہ اِستعانت (خُدا سے مانگنا) جزوِ عبادت ہے اسی طرح اللہ سے ڈرنا شرطِ عبادت بھی ہے اور عبادت بھی، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ خوفِ خُدا تو ہر عبادت کی جان ہے، جیسا کہ اس فرمانِ خُداوندی سے ظاہر ہے: وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيفَةً وَّدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ وَلَا تَكُن مِّنَ الْغَافِلِينَ (۷/۲۰۵) اور اپنے ربّ کو اپنی جان میں یاد کر عاجزی کے ساتھ اور خوف کے ساتھ اور کم آواز کے ساتھ صبح اور شام اور غافلوں سے مت ہونا۔ اِس پُرحکمت آیت

ISW Institute for Spiritual Wisdom Luminous Science Knowledge for a united humanity

میں ذِکر و عبادت کے اسرارِ عظیم کی طرف توجّہ دلائی گئی ہے۔

اِس موضوع کے سلسلے میں شاید یہ سوال پیدا ہوگا کہ جب حضرت ابراہیمؑ کے پاس کچھ فرشتے آگئے، تو آپؑ نے دل ہی دل میں ایک خوف محسوس کیا (۱۱/۷۰) حضرت موسیٰؑ کئی مواقع پر ڈر گئے (۲۸/۱۸، ۲۸/۲۱، ۲۰/۶۷، ۲۰/۲۱) اور حضرت داؤدؑ کو بھی فرشتوں سے خوف ہُوا (۳۸/۲۲) اِس میں کیا راز ہے، جبکہ اللہ کے دوستوں کو ماسواء اللہ سے نہیں ڈرنا ہے؟

جواب: (الف) مذکورہ پیغمبروں کی ان مثالوں میں رُوحانی معجزات کی عظمت و جلالت سے خوفزدہ ہونے کا ذکر ہے، اور یہ دُنیاوی خوف ہرگز نہیں۔

(ب) انبیاء و ائمّہ علیہم السّلام کی عملی زندگی لوگوں کے عرُوج و ارتقاء کا نمونۂ پیروی ہُوا کرتی ہے، چُنانچہ حکمت و مصلحت یہی تھی کہ وہ حضرات شروع شروع میں ایک طرح سے ڈر جائیں، اور اللہ اُن میں سے ہر ایک سے فرمائے کہ: لَا تَخَف = نہ ڈر، تو پھر اِس حُکم کے بعد اولیاء اللہ (۱۰/۶۲) دُنیاوی خوف سے بالاتر ہو جاتے ہیں، اور اگر یہ بات نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ کے حکیمانہ ناموں میں سے ایک نام ذِی المعارج (سیڑھیوں والا) نہ ہوتا، اور یاد رہے کہ خُدا کی سیڑھیاں انبیاء و ائمّہ علیہم السّلام کی صُورت میں ہیں، اس کا مطلب یہ ہُوا کہ پہلے تو ہادیٔ برحق خُود ارتقاء کی سیڑھی زینہ بزینہ چڑھتا ہے، اور خُدا کی سیڑھی بن جاتا ہے، پھر دُوسروں کو اسی طرح چڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔

نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی

۲۲- نومبر ۱۹۸۴ء

حکمتِ حدیث

۱۔ حضرت امام جعفر الصّادق علیہ السّلام سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے حضورِ اقدس میں آکر عرض کیا کہ یا رسُول اللہؐ آپ میرے حق میں دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے بہشت میں داخل کر دے، رسُولِ اکرمؐ نے اُس آدمی سے فرمایا کہ دیکھو میں تمھارے لئے دُعا کروں گا اور تم سجدوں کی کثرت سے اس میں میری مدد کرو۔ اس حدیثِ شریف سے جہاں ایک طرف کثرتِ سجوُد کی فضیلت ظاہر ہو جاتی ہے، وہاں دُوسری جانب یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اعلیٰ ترین دُعا بھی بندۂ مومن کے عمل سے مشروُط ہے، جس کے بغیر کوئی سفارش آگے نہیں بڑھ سکتی ہے، جیسا کہ سورۂ نجم (۵۳/۲۶) میں ارشاد ہُوا ہے:۔

(ترجمہ): اور بہت سے فرشتے آسمان میں موجُود ہیں ان کی سفارش ذرا بھی کام نہیں آسکتی مگر بعد اس کے کہ اللہ جس کے لئے چاہے اجازت دے اور راضی ہو (۵۳/۲۶)، اس ربّانی تعلیم کا واضح اشارہ یہ ہے کہ عظیم فرشتے تو اپنی خصوصیّت و عادت کی بناء پر اہلِ زمین کے لئے

نیک دُعا کرتے رہتے ہیں، مگر وہ دُعا کسی بندے کے حق میں اس وقت قبول ہو جاتی ہے جبکہ وہ علم و عمل سے آراستہ ہو جاتا ہے۔

۲۔ امامِ موصوفؑ سے روایت کی گئی ہے کہ پیغمبرِ خداؐ نے ارشاد فرمایا: علم کا پہلا مرحلہ خاموشی ہے، دُوسرا مرحلہ غور سے سُننا ہے، تیسرا اس پر عمل کرنا، اور چوتھا اس کا پھیلانا ہے۔ اِس حدیث کا ظاہری پہلو محتاج وضاحت نہیں، کیونکہ وہ خُود واضح ہے، چُنانچہ یہاں جو سوال پیدا ہو جاتا ہے وہ اس حُکم کی تاویلی حکمت سے متعلّق ہے کہ اِس سِلسلے میں آنحضرت کی سیرتِ طیّبہ سے کیا اشارہ مِلتا ہے؟ اس کا جواب یقیناً یہی ہے کہ خاموشی سے ذکر و عبادت کا نتیجہ مُراد ہے، جو محویّت و فنا کی شکل میں سامنے آتا ہے، جس کا نمونہء اعلیٰ سرورِ انبیاء صلوات اللہ علیہ و آلہ کی ابتدائی زندگی ہی سے مِلتا ہے کہ آپؐ علم کے مرحلہء اوّل میں کثرت سے عبادت کرتے ہُوئے عالمِ دِل پر ایسے سکوت کی کیفیّت طاری کر لیتے تھے، کہ اس میں اللہ جلّ شانہ کے اسمِ اکبر کے سوا ہر قلبی آواز مفقوُد ہو جاتی تھی، اِس مثال کا منشا یہ ہے کہ اگر کسی اِنسان کے دل میں وسوسوں یا خیالات و افکار کا طوفان برپا ہے تو اس صوُرت میں اگرچہ وہ بظاہر خاموش ہو لیکن اصل خاموشی نہ ہو گی لہٰذا دُنیائے دِل کی مکمّل خاموشی کے لئے پیغمبرِ اسلامؐ کی پیروی کرتے ہُوئے یادِ خُدا کا سہارا لینا ہو گا۔

۳۔ ایک موقع پر حضورِ انورؐ نے فرمایا: اِنَّ عَلِیًّا مِنِّیْ وَ أَنَا مِنْہُ۔ بیشک علی مجھ سے ہے اور مَیں اُس سے ہوں۔ اِس

ارشاد میں بہت سی حکمتیں ہیں، اُن میں سے چند اس طرح ہیں:۔

الف : نورِ نبوّت سے نورِ ولایت کا ظہور ہو جاتا ہے، اور پھر نبیؐ کا نور ولیؑ (امامؑ) کے نور میں مدغم ہو جاتا ہے۔

ب : پیغمبرؐ نے بحکمِ خدا مولا علیؑ کو تمام مسلمانوں کا امام بنایا، اور علیؑ نے علم وحکمت کے باب (دروازہ) کی مرتبت میں آنحضرتؐ کی نورانیّت سے لوگوں کو آگاہ کر دیا۔

ج : مقامِ تنزیل پر ناطقؑ نے اساسؑ کا ظاہری تعارف کرایا، اور مقامِ تاویل پر اساسؑ نے ناطقؑ کی باطنی معرفت کی تعلیم دی۔

۴۔ رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے یہ روایت منقول ہے، آپ فرماتے ہیں کہ : جو لوگ خدا پر اور مجھ پر ایمان لے آتے ہیں اور میری نبوّت کی تصدیق کر چکے ہیں، میں ان کو امیرالمؤمنین مولا علی ابنِ ابی طالب علیہ السّلام کی ولایت کی وصیّت کرتا ہوں، کیونکہ علیؑ سے محبّت کرنا مجھ سے محبّت کرنا ہے، یہ ایک امر ہے جس کے لئے میرے ربّ نے مجھ کو مامور فرمایا ہے، اور ایک ایسا عہد ہے جو مجھ سے لیا گیا ہے اور مجھے حکم ہوا ہے کہ میں یہ پیغام تم کو پہنچا دوں۔

حضرت رسالت مآبؐ کی اس نورانی تعلیم میں سب سے عظیم حکمت یہ ہے کہ خدا اور اس کے رسولؐ پر ایمان لانا دین کا پہلا مرحلہ ہے، نبوّت ورسالت کی تصدیق کرنا دوسرا مرحلہ ہے، اور مولا علی صلوات اللہ علیہ کی ولایت کا اقرار کرنا تیسرا مرحلہ ہے، اِس نکتہ میں بہت سے

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

اشارے ہیں، دُوسری حکمت لفظ "ولایت" میں ہے کہ اس کے کئی معنی ہیں؛ اور تیسری حکمت اس بات میں ہے کہ خداوندِ عالم نے حضرت خاتم الانبیاءؐ سے ولایتِ علیؑ کے باب میں عہد لیا، اور یہ حکمت ایسی اہم ترین اور مفید ترین ہے کہ اس کے سمجھ لینے سے قرآنِ حکیم کے بہت سے اسرار کھُل جاتے ہیں؛ جس کی ایک مثال اس طرح ہے :۔

سورۂ احزاب (۳۳/۷) میں ارشاد فرمایا گیا ہے : اور جبکہ ہم نے تمام پیغمبروں سے ان کا اقرار لیا اور آپؐ سے بھی اور نوحؑ اور ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ ابنِ مریمؑ سے بھی اور ہم نے ان سے خوب پختہ عہد لیا (۳۳/۷) جو حدیث صحیح ہوتی ہے وہ آیاتِ قرآنی کی عقلی اور منطقی ترجمانی کرتی ہے؛ چنانچہ ظاہر ہے کہ اس آیۂ کریمہ کی وضاحت مذکورۂ بالا حدیث سے فرمائی گئی ہے، یعنی پروردگارِ عالم نے ہر پیغمبر سے اس بات کا عہد لیا تھا کہ وہ لوگوں کو امرِ امامت سے آگاہ کرے گا۔

۵۔ حضرت علی علیہ السّلام سے روایت ہے، آپ نے فرمایا کہ : علم کے اُٹھ جانے سے پہلے اسے حاصل کر لو، آپ نے دستِ مبارک بلند کر کے فرمایا کہ علم اس طرح نہیں اُٹھے گا، لیکن بات یہ ہے کہ قوم میں عالِم ہوگا، پھر وہ اس دُنیا سے چلا جائے گا اور اسی کے ساتھ علم بھی اُٹھ جائے گا، اور قوم میں دُوسرا عالِم ہوگا، وہ بھی وفات پائے گا اور اس کا علم بھی رفع ہو جائے گا ....

۶۔ رسُولِ اکرم صلعم سے روایت کی گئی ہے، آپ نے فرمایا کہ : اللہ تعالےٰ

لوگوں سے علم بطریقِ انتزاع (کھینچ کر) قبض نہیں کرتا، لیکن عُلماء کی وفات سے علم کو اپنے قبضۂ قدرت میں لیتا ہے.......

ح ۵ اور ح ۶ سے ظاہر ہے کہ علم مٹّی میں نہیں جاتا، بلکہ خُدا اسے اپنے ہاتھ میں اُٹھا لیتا ہے، جبکہ یہ ایک تخت پر بلند ہو جاتا ہے، اور تخت نیک اعمال سے بنتا ہے، جیسا کہ ارشادِ خُداوندی ہے: پاک قول (یعنی علم) اسی کی طرف بلند ہو جاتا ہے اور عملِ صالح ہی اس کو اُٹھا کر لے جاتا ہے ($\frac{۳۵}{۱۰}$)

۷۔ حضرت امیرالمؤمنین علی صلواۃ اللہ علیہ وسلامہ سے روایت ہے کہ پیغمبرِ خُدا صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا: میرے اہلِ بیت کا مقام تمہارے درمیان کشتیٔ نوح ع کی طرح ہے کہ جو اس میں سوار ہو گیا اس نے نجات پائی اور جس نے اس کی مخالفت کی وہ غرق ہو گیا، آپ ص نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ: میرے اہلِ بیت کے عالِم سے علم حاصل کرو یا پھر اُس سے جس نے خُود اہلِ بیت کے عالِم سے علم حاصل کر لیا ہو، تاکہ تم دوزخ سے نجات پاؤ گے۔ کشتیٔ نوح ع اور عالمِ اہلِ بیت سے امامِ زمان ع مُراد ہے، جو خُدا و رسُول ص کی طرف سے طوفانِ جہالت اور آتشِ نادانی سے لوگوں کو بچانے کے لئے مقرّر ہے؛ یہی سبب ہے کہ قرآنِ حکیم کی تمام مثالوں میں حقیقی علم کی جتنی تعریف کی گئی ہے، جہالت و نادانی کی اتنی مذمّت ہے۔

۸۔ یہ ایک مشہور و معرُوف تاریخی واقعہ ہے کہ غدیرِ خُم میں حضور

اکرمؐ نے اصحاب سے مخاطب ہوکر فرمایا: اے لوگو! خُوب جان لوکہ علیؑ کا مرتبہ میرے نزدیک وہی ہے جو ہارُون کا مرتبہ موسیٰ کے نزدیک تھا مگر میرے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، علیؑ میرے بعد ولی ہے، اور جس کا مَیں مولا و آقا ہُوں اس کا علیؑ مولا و آقا ہے، پھر آپ نے دونوں ہاتھوں کو اُٹھا کر دُعا کی کہ: اے اللہ! تُو اُس شخص سے محبّت کر جو علیؑ سے محبّت کرتا ہے اور اُس سے عداوت کر جو علیؑ سے عداوت کرتا ہے اور اُس کی مدد کر جو علیؑ کی مدد کرتا ہے اور اس کی مدد نہ کر جو علیؑ کی مدد نہیں کرتا، اور علیؑ جہاں کہیں بھی ہو وہیں حق بھی اس کے ساتھ کر دے۔

رسُولِ کریم کا یہ ارشاد کئی اعتبارات سے بہت بڑی اہمیّت کا حامل ہے، اور یہ نہ صرف دین کی اساسی حقیقتوں سے بھرپُور ہے بلکہ اعلیٰ حکمتوں سے بھی مملو ہے، اس میں سب سے پہلے ضرُوری طور پر سُنّتِ خُدائی اور قرآنی حوالے کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے فرمایا ہے کہ دینِ حق میں آسمانی کتاب کی وراثت اور پیغمبر کی جانشینی کوئی نیا واقعہ نہیں، بلکہ ہمیشہ سے اللہ تعالیٰ کا یہی قانُون رہا ہے، مگر اس میں یہ فرق ضرور ہے کہ آنحضرت کے بعد کوئی نبی نہیں، اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں لوگوں کے لئے ہادیٔ برحق کا تقرّر اپنی سُنّت قرار دیا ہے، جس کی رُوح میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔

اس ارشادِ نبوی سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ کے بعد کوئی نبوّت و رسالت نہیں، مگر ولایت و امامت ہے، کیونکہ مذکورہ حدیث

بزبانِ حکمت یہ کہہ رہی ہے کہ ہمیشہ مولا و آقا کا موجود ہونا ضروری ہے۔

یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ صاحبِ خُلقِ عظیمؐ (۶۸: ۴) کسی ایسے جذبے کے تحت مولا علیؑ کے حق میں دُعا کرے جو سُنّتِ الٰہی اور قانونِ دین کے خلاف ہو، اس سے ظاہر ہے کہ یہ دُعا دراصل دستورِ دین کی ترجمانی کی غرض سے ہے، اور یہ اسلام کی سب سے حسین ترین مثال ہے کہ خدا اُس شخص سے محبّت کرے جو اس کے مظہر سے محبّت کرتا ہے، اور علم و رحمت کا سب سے عظیم خزانہ اسی تصوّر میں پوشیدہ ہے جو رسُولِ اکرمؐ نے دیا۔

۹۔ ارشادِ نبوی ہے: العلم نور یجعلہ اللہ فی قلب من یشاء من عبادہ = علم ایک نور ہے خُدا اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے یہ (نُور) اس کے دِل میں رکھتا ہے۔ یہ صفت سب سے پہلے اور سب سے کامل طور پر حضراتِ انبیاء و أئمہؑ علیہم السّلام کے لئے شایانِ شان ہے، اور پھر اسی وسیلے سے بقدرِ اطاعت ہر مومن کو علم کی روشنی مل سکتی ہے، بہرکیف علم نور ہے اور نور علمی صورت میں ہے، چنانچہ قرآنِ مُقدّس میں جہاں نور کا ذِکر ہے وہ علم کی بات ہے، اور جہاں علم کا تذکرہ ہے، وہ نور کا بیان ہے۔

نور کی ظاہری تعریف یہ کی گئی ہے کہ نُور وہ شَی ہے جو پوشیدہ چیزوں کو ظاہر کرتی ہے اور خود بھی ظاہر ہوتی ہے، جیسے سُورج، مگر نُور کی یہ تعریف کافی نہیں، کیونکہ اس کا دُوسرا پہلو بھی ہے، جو اس سے مختلف ہے، مثال کے طور پر جب صبحِ صادق کا وقت ہوتا ہے تو تب سے روشنی پھیلنے لگتی ہے، بغیر

اِس کے کہ سُورج طلوُع ہو چُکا ہو، نیز روشنی اس وقت بھی ختم نہیں ہوتی، جب سُورج بادلوں کے اوٹ میں ہوتا ہے، اس کا مطلب یہ ہُوا کہ نوُر ظاہر بھی ہے اور باطن بھی، وہ دکھائی دیتا ہے اور دکھائی نہیں دیتا، چُنانچہ نوُرِ علم کی دو صُورتیں ہُوا کرتی ہیں، ایک وہ جو نظر آتی ہے، اور دُوسری وہ جو نظر نہیں آتی، مگر ان دونوں صوُرتوں میں عِلم کا وجوُد ہوتا ہے۔

۱۰۔ نوُر اگرچہ سرچشمۂ اعلیٰ میں ایک ہی ہے، لیکن مذکورہ دو صُورتوں (مرئی اور غیر مرئی) کے تحت اس کی بہت قسمیں ہیں، جیسے حضرت امام جعفر الصّادق ؑ کا یہ دُعائیہ ارشاد ہے، جس میں یہ مطلب واضح ہو جاتا ہے کہ ظاہر و باطن کے حواس میں سے ہر حس، ہر قوّت اور ہر جہت کے لئے ایک نوُر مقرّر ہے، وہ دُعا یہ ہے :-

اَللّٰھُمّ اجعل لی نوُراً فی قلبی، ونوُراً فی سمعی، ونوُراً فی بصری، ونوُراً فی لسانی، وَ نوُراً فی شعری، وَنوُراً فی بشری، ونوراً فی لحمی، ونوراً فی دمی، ونوُراً فی عظامی، و نوُراً فی عصَبی، ونوراً مِن بین یدَیَّ ونوراً مِن خلفی، ونوراً عن یمینی، ونوراً عن یساری، ونوُراً مِن فوقی، ونوراً مِن تحتی۔

(ترجمہ) یا اللہ میرے لئے میرے دِل میں ایک نوُر بنا دے، میرے کان میں ایک نوُر، میری آنکھ میں ایک نوُر، میری زبان میں ایک نوُر، میرے

بالوں میں ایک نور، میری کھال میں ایک نور، میرے گوشت میں ایک نور، میرے خون میں ایک نور، میری ہڈیوں میں ایک نور، میری رگوں میں ایک نور، میرے سامنے سے ایک نور، میرے پیچھے سے ایک نور، میرے دائیں سے ایک نور، میرے بائیں سے ایک نور، میرے اوپر سے ایک نور، اور میرے نیچے سے ایک نور بنادے۔

اِس سے یقینی طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ انسانِ کامل کا مبارک وجود سراپا نور اور اللہ کی قدرتِ کاملہ کا ایک مکمل نمونہ ہُوا کرتا ہے، جس میں اگرچہ نور اصلاً ایک ہی ہوتا ہے تاہم مختلف حواس و مدرکات کی تقویت و رہنمائی کی خاطر اس کی الگ الگ قسمیں ہوتی ہیں، جیسے مذکورۂ بالا دعا سے ظاہر ہے۔

۱۱۔ ائمۂ اہلِ بیت علیہم السّلام سے روایت کی گئی ہے کہ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا:

لَا عَمَلَ اِلَّا بِنِیَّۃٍ، وَلَا عِبَادَۃَ اِلَّا بِیَقِیْنٍ، وَلَا کَرَمَ اِلَّا بِالتَّقْوٰی

کوئی عمل نیّت کے بغیر مقبول نہیں، نہ یقین (معرفت) کے بغیر کوئی عبادت قبول ہوتی ہے، اور نہ تقویٰ کے بغیر کوئی کرامت و بزرگی ہے۔

نیّت کے بارے میں جیسا حکم ہے اس کو سب جانتے ہیں، مگر بے یقین عبادت اور بایقین عبادت کے درمیان جو فرق و تفاوت ہے اس کا جاننا ہر شخص کے بس کی بات نہیں، چنانچہ جاننا چاہیئے کہ لفظ یقین دراصل معرفت کے مترادفات میں سے ہے، جبکہ یقین کے معنی قرآنی

اعتبار سے بہت اعلیٰ ہیں، جیسے علم الیقین، عین الیقین، اور حقّ الیقین، اس کا مطلب یہ ہوا کہ مقبول عبادت کا پہلا مقام علم الیقین ہے، دُوسرا عین الیقین اور تیسرا حقّ الیقین ہے، اور یہ معرفت کے درجات ہیں۔ الحمدُ للّٰہ ربّ العالمین۔

نوٹ: اس مقالہ کی تمام حدیثیں کتابِ "دعائم الاسلام" جُزءِ اوّل سے لی گئی ہیں۔

امامِ اقدس واطہرؑ کا ایک ادنیٰ غلام

نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی

۱۲- نومبر ۱۹۸۴ء

رُوح اور حضرت آدمؑ

رُوح اور حضرت آدم علیہ السّلام کے موضوع کے سلسلے میں سب سے پہلے یہ جاننا ازبس ضروری ہے کہ آیا قبل از آدمؑ لوگ کسی بھی سیّارے پر موجود تھے یا نہیں؟ اگر وجودِ انسانی کا سلسلہ پہلے ہی سے چلا آیا ہے، تو اُس کا کیا ثبوت ہے؟ اگرچہ اِس کا مدلّل بیان کتاب "رُوح کیا ہے؟" میں ہو چکا ہے تاہم اِس موضوع کی بہت بڑی اہمیت ہونے کی وجہ سے یہاں بھی چند روشن دلائل پیش کئے جاتے ہیں کہ اِنسان بالکل ایسا قدیم ہے، جیسی خُدا تعالیٰ کی بادشاہی قدیم ہے، وہ دلیلیں مندرجۂ ذیل ہیں:۔

۱۔ سورۂ روم کے ایک ارشاد (۳۰:۳۰) میں جس طرح فرمایا گیا ہے اس کا واضح مفہوم یہ ہے: "دینِ حنیف (اسلام) دینِ فطرت ہے، اور اللہ تعالےٰ کی فطرت (تخلیق و پیدائش) وہی ہے جس پر اُس نے لوگوں کو پیدا کیا، خُدا کی پیدائش کا جو طریقہ مقرّر ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں، اور یہی دینِ قائم ہے"۔ اِس قرآنی دلیل سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ حضرت آدم علیہ السّلام کی جسمانی پیدائش قانونِ فطرت کے عین مطابق تھی، یعنی آپؑ کو اللہ تعالیٰ نے

بالکل اسی طرح پیدا کیا تھا جس طرح وہ دُوسرے سب لوگوں کو پیدا کرتا ہے۔

۲۔ لفظِ انسان، اِنس اور انسیّا کو بھی مِلا کر قرآنِ حکیم میں کُل ۸۴ بار استعمال کیا گیا ہے، یہ افرادِ بشر کا ایک ایسا مُشترکہ نام ہے، کہ اِس کا اطلاق نہ صرف بنی آدم پر ہوتا ہے، بلکہ اس کا اشارہ سب سے پہلے آدمؑ کی طرف ہوتا ہے، چُنانچہ سورۂ دہر کے آغاز (۷۶/۲) میں جس طرح اِنسان کی پیدائش کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا ہے، اس کی وضاحت کے بعد یہ کُلیّہ (عام قاعدہ) بن جاتا ہے کہ ہر اِنسان ماں باپ سے پیدا ہو جاتا ہے، خواہ وہ حضرت آدمؑ ہو یا حضرتِ عیسیٰؑ، کیونکہ وہ دونوں عظیم پیغمبر بھی جسم سے انسان تھے۔

۳۔ سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۱۳ میں یہ تذکرہ موجُود ہے کہ سِلسلۂ انبیاء کے شروع ہونے سے قبل لوگ ایک ہی اُمّت تھے، یا ایک ہی طریق پر تھے، پھر اللہ نے پیغمبروں کو بھیجا (۲/۲۱۳) اس سے صاف ظاہر ہُوا کہ حضرت آدم علیہ السّلام مذکورہ لوگوں کے بعد اور انبیاء علیہم السّلام کے سِلسلے میں نبیّ اوّل کی حیثیت سے تھے۔

۴۔ قرآنِ حکیم میں آدم و اولادِ آدم کی پیدائش سے متعلّق ایک ہی قانُون کا ذِکر بار بار مِلتا ہے، جو لفظِ اِنسان کے تحت آتا ہے جیسے سورۂ مومنون (۲۳/۱۲–۱۴) میں تخلیقِ اِنسانی کے سات مراحل کا ذکر فرمایا گیا ہے، وہ منزلیں یہ ہیں:

الف: خُلاصۂ خاک۔

ب : نطفہ۔

ج : عَلَقہ۔

د : مُضغہ۔

ہ : عِظام۔

و : لحم۔

ز : خلقِ آخر۔

پیدائش کے ان درجات سے گزرے بغیر کوئی فردِ بشر خلقِ آخر نہیں بن سکتا، اور نہ ہی وہ احسن الخالقین کی مخلوق کہلا سکتا ہے (۲۳/۱۴)

۵۔ آلِ عمران کے ایک ارشاد (۳/۵۹) میں غور کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت آدمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش ایک جیسی (یعنی قانونِ فطرت کے مطابق) تھی، اور اُن دونوں کی رُوحانی تکمیل کے موقع پر خُداوند تعالیٰ نے کُنْ (ہوجا) فرمایا تھا، اس حُکم سے یقیناً یہ معلوم ہوگیا کہ حضرت آدمؑ کے جسمانی والدین تھے، جس طرح حضرت عیسیٰ کے ماں باپ تھے، وہ حضرت مریم اور یُوسف نجّار تھے۔

۶۔ آپ حکیم ناصر خسروؒ کے "رسالۂ حکمتی" جو فارسی میں ہے کو دیکھ سکتے ہیں کہ جِنّ کا اصل فارسی ترجمہ "پری" ہے، یعنی ایسی پوشیدہ اور لطیف مخلوق جو پرواز کر سکتی ہے، چُنانچہ قرآنِ پاک (جو اللہ تعالیٰ کے عظیم بھیدوں کا خزانہ ہے) میں باعتبارِ پیدائش کبھی اِنسان پہلے ہیں اور کبھی جنّات (۱۵/۲۷) (۵۵/۱۴-۱۵) جس کی وجہ دائرۂ آفرینش ہے جس پر یہ دونوں مخلوق شب و روز کی طرح ہیں، یا یُوں کہنا چاہیئے کہ ریشم کے

کیڑوں اور ان سے بنے ہوئے پروانوں کی طرح ہیں، اگر آپ کیڑوں کے موسم میں ان کے ماضی کا تذکرہ چھیڑنا چاہتے ہیں تو یہ کہنا درست ہوگا، کہ پہلے پروانے تھے، اگر اس کے برعکس پروانوں کا وقت ہے تو آپ یہ کہیں گے کہ پہلے کیڑے تھے، یہ تو جزوی بات ہوگئی، اور اگر آپ کو اس سلسلے کی کلّی بات کرنی ہے تو پھر کہنے لگیں گے کہ دونوں قسم کی مخلوق میں کوئی زمانی تقدیم و تاخیر نہیں، یعنی باعتبارِ وقت ایک آگے اور ایک پیچھے نہیں۔

۷۔ اب یہاں مذکورہ حقیقتوں کی روشنی میں یہ عرض کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بادشاہی کی نہ تو کوئی ابتداء ہے اور نہ کوئی انتہا، بلکہ یہ ہمیشہ قائم ہے، اور اس بادشاہی کے تحت انسان کا بھی ہمیشہ ہونا لازمی ہے، چنانچہ ہر دور کے لئے ایک آدم ہوا کرتا ہے، اور ہر دور کے آخر میں انسان کثیف سے لطیف ہو جاتے ہیں، یہ صرف جسم کی بات ہے، اعمال کی بات نہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اِس دَور کے آدم سے قبل سیّارۂ زمین پر جنّات کے کثرت سے ہونے کی جو روایت ملتی ہے، وہ بالکل صحیح ہے، اور اِس دَور کے آخر میں بھی اِنسان کو جسمِ لطیف عطا ہوگا، جس کی مثال اُڑن طشتری ہے، جس کے بہت سے قرآنی نام ہیں۔

۸۔ اگر ہم نظامِ ادوار کو مانتے ہیں، اور اس کے ساتھ ساتھ حکمتِ قرآن کو بھی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو پھر اِس قانونِ رُوح کو قبول کرنا ہوگا کہ جب آدمِ سابق کا دَور مکمل ہو کر ہمارے بابا آدم کا دَور شروع ہوا، تو اُس وقت پروردگارِ عالمین نے تمام اگلے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی ذرّیات

کو لے کر خلیفۂ دورؑ (یعنی آدمؑ) کی رُوحانیّت میں حاضر کر دیا، اور عہدِ پیمان لینے کے بعد ان کو موجودہ آدمؑ کی اولاد قرار دیا (۷/۱۷۲)، اور یہی معجزۂ سلسلۂ خلافت (یعنی نبوّت و امامت) کی ہر شخصیّت میں سب سے پہلے واقع ہوتا ہے۔

۹۔ قصّۂ آدمؑ میں جس طرح رُوح کا ذکر فرمایا گیا ہے، اِس میں انتہائی عظیم حکمتیں پوشیدہ ہیں، جیسے خُدائے بزرگ و برتر نے رُوحِ کامل کو حضرت آدمؑ میں پھونک دینے سے پہلے اپنی ذاتِ پاک سے منسوب کرتے ہُوئے فرمایا: رُوحی (۱۵/۲۹، ۳۸/۷۲، یعنی میری رُوح)، مگر یہاں جو سِرِّ عظیم پنہاں ہے، اس کی معرفت بڑی ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ مذکورہ خُدائی رُوح، جو جنابِ آدمؑ میں پھونک دی گئی، یا جو نور منتقل کیا گیا، وہ قبلاً دُوسرے انسانِ کامل میں تھا، اور یہاں "رُوحِ خدا – نورِ خدا" میں اللہ تعالیٰ کی خصوصی نسبت کا سوال پیدا ہوتا ہے، وہاں اِس حقیقت کی کئی قرآنی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، کہ اس میں ذاتِ سُبحان سے رُوحِ اعظم کی وابستگی جیسی کوئی بات نہیں، بلکہ یہ نسبت اِس رُوح کی عظمت، عُلوِ مرتبت، پاکیزگی، شرافت، اور قُربِ الٰہی کا نام ہے، اِس کی کچھ مثالیں درجِ ذیل ہیں:۔

۱۰۔ اللہ کی رسّی (۳/۱۰۳)، خُدا کا گھر (۲/۱۲۵)، خُدا کا ہاتھ (۴۸/۱۰)، پہلوئے خُدا (۳۹/۵۶)، چہرۂ خُدا (۵۵/۲۷)، اللہ تعالیٰ کے ایّام (۴۵/۱۴)، کتاب اللہ (۳۰/۵۶)، راہِ خُدا (۲/۱۰۸)، اُس کی کُرسی (۲/۲۵۵)، اس کا تخت (۶۹/۱۷)، قلمِ الٰہی (۹۶/۴)، وغیرہ، یہ تمام عالی مرتبت اور مُقدّس چیزیں جس طرح خُداوندِ تعالیٰ سے منسوب

کی گئی ہیں، اس کی وجہ اللہ پاک کی قربتِ خاص ہے، اور خدا کی رُوح ان مثالوں سے ہرگز مختلف نہیں، یعنی خدائے پاک اس بات سے بے نیاز و برتر ہے کہ رُوح اس کا جُزو ہو۔

۱۱۔ آپ نے قرآنِ حکیم کے عظیم موضوعات کے سلسلے میں "سُنّت اللہ" کے موضوع کا خوب غور سے مُطالعہ کیا ہوگا، کیونکہ یہ امر انتہائی ضروری ہے، خُدا کی سُنّت یا عادت، (جسے آپ قانُونِ الٰہی بھی کہہ سکتے ہیں) یہ ہے کہ وہ تبارک و تعالیٰ ہمیشہ سلسلۂ ہدایت کو جاری و باقی رکھتا ہے، اللہ کی عادت کی سب سے روشن حقیقت نُورٌ عَلٰی نُورٍ (۲۴ ؍ ۳۵) ہے، یعنی نُور کی ایک شخصیّت کے بعد دُوسری شخصیّت کا ہونا، اس سے ظاہر ہے کہ حضرت آدم علیہ السّلام وہ چراغِ علم و حکمت تھے، جس کو سابق چراغ کے شعلے سے فروزاں کیا گیا تھا، اور اگر آپ "ایک نُور کے بعد دُوسرا نور" اس کُلیّہ میں غور کریں، تو آپ کو بڑا تعجّب ہوگا کہ سلسلۂ نُور کا کوئی آغاز نہیں، یعنی اس کا کوئی ابتدائی سرا نظر نہیں آتا ہے، بلکہ یہ ازل سے ابد تک چلتا رہتا ہے۔

۱۲۔ اللہ تعالیٰ کے پروگرام یا اعلان کے مطابق خلافتِ آدمؑ کا تعلق اہلِ زمین سے تھا (۲ ؍ ۳۰) لیکن ایسا کیوں ہُوا کہ حضرت آدمؑ کے "علمِ اسماء" یعنی علمِ حقائق کا سارا فائدہ ہر بہانے سے فرشتوں کو حاصل ہُوا؟ آیا اس میں کوئی راز ہے؟ جی ہاں، اس میں بہت بڑا راز اور بہت بڑی حکمت ہے، وہ اس طرح کہ قصّۂ آدم کے فرشتے

اہلِ زمین ہی میں سے تھے، وہ اہلِ ایمان تھے، جن کو اپنی رُوح کے پرلے سرے سے نورِ آدم تک رسائی ہُوئی تھی، بالفاظِ دیگر وہ سب کے سب بصورتِ ذرّات اپنے وقت کے "عالمِ شخصی" میں داخل ہو گئے تھے، اس کے یہ معنی ہُوئے کہ رُوح کے دو سرے ہُوا کرتے ہیں، یہ سرا بشر ہے اور وہ سرا فرشتہ، رُوح ایک رستے کی طرح یا پُل کی طرح اِس لئے ہے کہ وہاں سے کوئی چیز آ جائے، اور یہاں سے کوئی چیز جائے، ہم اِس مثال کی روشنی میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ پیاری رُوح کے اِس پُل کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ دُنیا و آخرت کو باہم مِلا دیتا ہے۔

۱۳ - حضرت آدمؑ سے متعلّق قصۂ قرآن کے ہر ہر لفظ میں معرفت کے بھیدوں کا ایک خزانہ پوشیدہ ہے، مثال کے طور پر لفظِ نفخ (پھونکنا) کو لیجئے، کہ یہ لفظ مختلف صیغوں میں قرآنِ حکیم کے بیس مقامات پر مذکور ہے، اور ظاہراً ایسے تین الگ الگ معنوں کے لئے استعمال ہُوا ہے کہ وہ باطناً یکجا ہیں، وہ تین معنی یہ ہیں:-

الف: پھکنی (دھونکنی) سے پھونکنا، تاکہ لوہے کے ٹکڑے آگ کی طرح سُرخ ہو جائیں (۱۸/۹۶) اس کی تاویل "قیامت خیز عبادت" ہے، جو ہر پیغمبر اور ہر امام بجا لاتا ہے۔

ب: صور پھونکنا، کیونکہ انفرادی قیامت کے جُملہ مراحل سے آگے گزرے بغیر آدم علیہ السّلام حاملِ نور، خلیفۂ خُدا، سرچشمۂ علم و حکمت، اور فرشتوں کا مسجُود و مُعلّم نہیں ہو سکتے تھے۔

ج: رُوح پھونکنا، یہ نُوراً علیٰ نُورٍ کے دائمی قانُون کے تحت ایک کامل شخص سے دُوسرے کامل شخص میں نُور کی منتقلی کا نام ہے، پس جس طرح حضرت آدمؑ نے "اِنقلابی عبادت" کی، جیسی آپؑ کی ذاتی قیامت برپا ہُوئی، اور جس معنیٰ میں اُن میں نُور منتقل ہوگیا، اس کے حقائق و معارف اندرونی طور پر سراسر قرآنِ حکیم میں پھیل جاتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی بے بدل (اٹل) سُنّت کے مطابق جو حاملانِ نُور میں سے گزرتی چلی آئی ہے تمام انبیاء علیہم السّلام کا ایک ہی قِصّہ بن جاتا ہے۔

۱۴۔ اگرچہ ظاہری تاریخ آپ کو واقعاتِ آدمؑ سے ہزاروں سال دُور لے آتی ہے لیکن قرآن اور نُورِ ہدایت کا یہ معجزہ ہے کہ اس کی بدولت آپ یقیناً حضرت آدم علیہ السّلام کو انتہائی قریب سے دیکھ سکتے ہیں، کیونکہ عالم و آدم کی تخلیق سے خلافتِ الٰہیّہ مقصُود تھی، جو حسبِ منشائے خُداوندی سلسلۂ انبیاء و ائمّہ علیہم السّلام میں جاری و باقی ہے، جیسا کہ سورۂ نُور (۲۴/۵۵) میں ارشاد ہُوا ہے:۔

اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تُم میں سے اُن لوگوں کے ساتھ جو (بحقیقت) ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اُسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزُرے ہُوئے لوگوں کو بنا چکا ہے۔ اِس پُرحکمت تعلیمِ سماوی میں پیغمبروں اور اماموں کی خلافت کا ذِکر ہے، جو حضرت آدمؑ کی خلافتِ عالیہ کا سِلسلہ ہے جو رہتی دُنیا تک قائم رہے گی، مُسلمین و مومنین کو اس سے بیش از بیش فائدہ حاصل ہونے کے لئے زیادہ سے زیادہ فرمانبرداری

شرط ہے، تاکہ خلیفۂ خُدا جو ہر زمانے میں موجُود ہے کی معرفت حاصل ہو، پس اِسی پہچان میں تمام معرفتیں مرکوز ہوجاتی ہیں، اور یہی رُوح کی تفصیلی مُلاقات کا نتیجہ ہے۔

نصیرُالدّین نصیرؔ ہونزائی

۲۰۔ مارچ ۱۹۸۵

ISWLS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

لہ ہر پیغمبر اور ہر امام خُدا کے حُکم سے رُوح پھُونک دیتا ہے، حضرت عیسیٰ کی مثال دیکھئے: ۳/۴۹ ، ۵/۱۱۰

رُوحِ اسلام

رُوح کے معنی جان، جیو، آتما، نُور، ست، جوہر، اور دل ہیں، اسلام سے دینِ حق مُراد ہے، جسے بحکمِ خُدا حضورِ انور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے لوگوں کے سامنے پیش کیا، چونکہ اسلام اللہ تبارک وتعالیٰ کا دین ہے، اس لئے یہ تمام انبیاء علیہم السّلام کا واحد دین ہے، اور اِسی کا نام دینِ فطرت ہے۔

اِس اہم موضوع کے سلسلے میں سب سے پہلے اِس حقیقت پر قرآنی روشنی ڈالنے کی ضرُورت ہے کہ جملہ انبیاء و رُسل علیہم السّلام اپنے اپنے زمانے میں ایک ہی دینِ حق کی دعوت و تبلیغ کیا کرتے تھے، اور وہ خُدائے واحد کا یکتا و یگانہ دین تھا، جس کی تعبیر بعد کے زمانے میں لفظِ "اسلام" سے کی گئی، جیساکہ پروردگارِ عالم کا مُقدّس ارشاد ہے:۔

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَّالَّذِيَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ ۖ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ

(۴۲/۱۳) اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے واسطے وہی دین مقرّر کیا جس کا اُس نے

نوحؑ کو حکم دیا تھا اور جس کو ہم نے آپ کے پاس وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے اور جس کا ہم نے ابراہیمؑ اور موسیٰ اور عیسیٰؑ کو حکم دیا تھا کہ اسی دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔

اس آیۂ حکمت آگین سے یہ حقیقت بدرجۂ یقین روشن ہو کر سامنے آتی ہے کہ دینِ اسلام اور اس کی شریعتِ عالیہ کا آغاز دراصل زمانۂ نوحؑ سے ہوا، اس کے واضح معنی یہ ہوتے کہ اسلام دینِ فطرت ہے، اور فطرت کا بہترین نمونہ اس کائنات میں انسان ہیں (۳۰/۳۰) قرآنِ حکیم کے اس حوالہ میں کہ: "خدا کی فطرت وہ ہے جس کے مطابق اُس نے لوگوں کو پیدا کیا (۳۰/۳۰)" بہت سے اشارات موجود ہیں، مختصر یہ کہ اسلام دینِ فطرت ہونے کی بناء پر اپنے اندر زمان و مکان کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگی کی صلاحیت رکھتا ہے، کیونکہ یہ آفاقی دین ہے، لہٰذا یہ ہمیشہ زندہ غیر منجمد اور حرکیاتی (DYNAMIC) ہے، جیسا کہ شَرَعَ لَكُم ..... (۴۲/۱۳) کی آیتِ پاک میں بزبانِ حکمت فرمایا گیا ہے کہ حضراتِ انبیاءؑ نے اسلام کو وقت اور جگہ کے مطابق لوگوں کے سامنے پیش کیا تھا، مگر دین کی رُوح اور حقیقت ہمیشہ سے کسی تبدیلی کے بغیر ایک ہی شان سے چلی آئی ہے۔

اس وضاحت کے باوجود کوئی شخص قرآنِ مقدس ہی کے حوالے سے یہ سوال کر سکتا ہے کہ: جب خدا تعالیٰ نے ہر اُمّت کے لئے ایک شریعت اور ایک مِنھاج یعنی طریقت (۵/۴۸) مقرر کر دی ہے، تو پھر ہم کس طرح اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ آج جو شریعتِ محمدیؐ ہے،

وہ زمانۂ نوحؑ میں بھی تھی؟

اِس کے جواب کے لئے میں یہ عرض کروں گا کہ دین اُس مُقدّس مجمُوعۂ تعلیمات کا نام ہے جس میں شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت سے متعلّق باتیں جمع ہُوا کرتی ہیں، چُنانچہ دین ہمیشہ بحیثیتِ مجمُوعی اپنی جگہ قائم رہتا ہے، مگر شریعت اور طریقت کے بعض امُور میں بمقتضائے زمان و مکان ترمیم ہوسکتی ہے، پس شریعت کے دو پہلو ہوگئے، ایک وہ جو شروع میں جیسا تھا، اب بھی ویسا ہے، دُوسرا پہلُو وہ ہے جس میں بحکم خُدا ترمیمات ہوتی رہی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا مُبارک ارشاد ہے: وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ (۳۷/۸۳) اور تحقیق نوحؑ کے طریقہ والوں سے ابراہیمؑ بھی تھے۔ یعنی حضرت ابراہیمؑ مذکورہ قانون کے مطابق حضرت نوحؑ کے پیرو بھی تھے، اور آپؑ کی اپنی ایک شریعت و طریقت بھی تھی، جس طرح آنحضرتؐ ایک طرف سے ملّتِ ابراہیمی کی پیروی کرتے تھے، اور دُوسری طرف سے اپنی شریعت و طریقت رکھتے تھے، جیسا کہ قرآنِ حکیم میں ہے:۔

قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا (۶/۱۶۱)

آپ کہہ دیجئے کہ مجھ کو میرے ربّ نے ایک سیدھا رستہ بتلا دیا ہے کہ وہ دین قائم ہے جو طریقہ ہے ابراہیمؑ کا جس میں ذرا کجی نہیں۔ اِس قرآنی حُکم سے ظاہر ہے کہ اگرچہ خُدا تعالیٰ نے ہر بڑے پیغمبر کو ایک

مخصوص ذیلی شریعت و طریقت عنایت کردی تھی، تاہم یہ بھی ایک روشن حقیقت ہے کہ جملہ انبیاء و رُسُل علیہم السّلام کا مُشترکہ دین اسلام ہی تھا، جس کا آغاز ظاہراً زمانۂ نوح ؑ سے ہوگیا تھا، کیونکہ یہ صراطِ مستقیم اور دینِ قائم ہے، جس کو ہر زمانے میں موجود رہنا ہے، اور اس کی عدم موجودگی کے لئے کوئی وقت نہیں۔

یہاں یہ سوال بھی ممکن ہے کہ کوئی پُوچھے کہ حضرت آدم ؑ کا کیا دین تھا؟ اس میں کیا راز ہے کہ دَورِ آدم ؑ کے لوگوں کے مذہب اور شریعت کے بارے میں قرآنِ حکیم کچھ نہیں بتاتا؟

اس سلسلے میں یہ عرض ہے کہ نہ صرف حضرت آدم ؑ کے زمانے میں بلکہ اس سے بہت بہت پہلے بھی "دینِ قائم" یعنی اسلام ہی تھا، مگر قانونِ حکمت کا تقاضا یہی ہے کہ دین کے اوّل و آخر کے مفصّل حالات کو پردۂ اخفا میں رکھا جائے، تاکہ نظامِ امتحان میں خلل نہ پڑے، اور جو لوگ غافل و کاہل ہیں، ان کو قبل از وقت عظیم بھیدوں کا پتہ نہ چلے، بس یہی وجہ ہے کہ قرآنِ پاک میں قصّۂ آدم ؑ بہت ہی مختصر اور انتہائی جامعیّت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

ایک اور سوال: جب سب پیغمبر ایک ہی دین پر تھے، جس کا نام صراطِ مُستقیم ہے (۱/۶، ۴۸/۶۹)، تو پھر اس کی کیا وجہ تھی کہ حضورِ اکرم ؐ نے حضرت موسیٰ ؑ اور حضرت عیسیٰ ؑ کو چھوڑ کر حضرت ابراہیم ؑ کی پیروی کی؟ کیا اس کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ خاتم الانبیاء ؐ اُن دونوں بزرگ پیغمبروں سے عظیم تر تھے؟ اگر بات

یوں ہوتی تو پیغمبرِ آخر زمانؐ حضرت ابراہیمؑ کی بھی پیروی نہ کرتے، کیونکہ حبیبِ خداؐ اعظمِ انبیاؑ اور سردارِ رُسل ہیں، تو پھر اس کا کیا سبب ہے؟

جواب: آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی مذکورہ پیروی کسی اور سبب سے نہیں بلکہ آسمانی پروگرام کے مطابق تھی، وہ مطالعۂ تاریخ اور پھر کسی طریقت ومسلک کا اِنتخاب جیسی بات نہ تھی، یہ پیروی اللہ کی مرضی سے ایک پیش آمدہ واقعیّت وحقیقت کی صُورت میں تھی، واقعہ یُوں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے بڑے فرزند حضرت اسماعیلؑ امامِ مُستقر تھے، اور چھوٹے فرزند حضرت اسحاقؑ امامِ مُستودع، چُنانچہ بنو اسماعیل میں امامتِ استقراری ہمیشہ کے لئے جاری وساری رہی، مگر حضرت اسحاقؑ کی نسل میں استیداعی امامت صرف آنحضرتؐ کے ظہور تک چل کر امامِ مُستقر میں مدغم ہوگئی، اس کا واضح مطلب یہ ہُوا کہ حضورِ اکرمؐ کے اپنے خاندان میں ائمۂ مُستقر کا پاک سِلسلہ جاری تھا، جس کے توسط سے رسُول اللہؐ نے بطورِ خاص قبل از نبوّت مِلّتِ ابراہیمی کی پیروی کی۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی یہ خواہش تھی کہ نہ صرف اپنی زندگی ہی میں بلکہ آئندہ زمانے میں بھی آپ کے لئے دین کے حقائق ومعارف بیان کرنے والی زبان مقرّر ہو، جیساکہ قرآنِ حکیم میں اِس حقیقت کا ذکر موجُود ہے:

اے میرے پروردگار مُجھے ایک حُکم (یعنی کلمۂ باری کی معرفت) عنایت کر اور مُجھ کو صالحین سے مِلا دے، اور میرے واسطے آئندہ آنے والوں میں حق وصدق کی زبان مقرّر کر دے ($\frac{26}{83-84}$) حضرت ابراہیمؑ

کی یہ دُعا لفظی فرق کے باوجود معنویت کی رُوح میں وہی ہے، جس میں آپؑ نے خدا تعالیٰ سے طلب کی تھی کہ آپؑ کی ذُرّیّت میں امامت قائم و برجا رہے (۲/۱۲۴) اور اللہ تعالیٰ نے آپؑ کی ہر دُعا کو قبول فرمایا تھا (۱۴/۳۵)، سو اس کے معنی یہ ہوئے کہ امام ہر زمانے میں موجود اور حاضر ہوتا ہے، جو حق باتیں بتانے کیلئے حضرت ابراہیمؑ کی زبان ہے، جس کی تعلیمات کی آنحضرتؐ نے پیروی کی تھی۔

یہ بات ہمیشہ کے لئے یاد رہے کہ قوانینِ اسلام اللہ تعالیٰ کی صفات و سُنّت ہی کے مطابق ہیں، اور دین کا کوئی قانون دائرۂ اسماء سے باہر نہیں، چنانچہ جب ارشاد ہوتا ہے کہ: ھُوَ الاوّل والآخر والظاھر والباطن (۵۷/۳) تو ان بابرکت ناموں کی اِس نُورانی تعلیم سے اہلِ دانش کو دینی حقیقتوں اور معرفتوں کے مقامات کا پتہ چلتا ہے، کیونکہ نہ صرف ضیا پاشی اور روشنی ہی بلکہ دینی دولت کی فراوانی بھی وہاں ہوتی ہے، جہاں اللہ پاک کی کوئی صفت جلوہ گر ہو، جیسے ہم کائناتِ ظاہر کو روشن و تابان اور عجائب و غرائب سے آراستہ اِس لئے دیکھتے ہیں کہ یہ خدائے بزرگ و برتر کے اسم "الظاھر" کے تحت موجود اور قائم ہے، اور اس میں اشیائے ظاہر کی کوئی کمی نہیں، اِس مثال سے یہ حقیقت نکھر نکھر کر روشن ہو جاتی ہے کہ اللہ جل جلالہ کے ان چار صفاتی اسماء سے چار عالموں کا وجُود قائم و باقی ہے، یعنی "الاوّل" سے عالمِ ازل، "الآخر" سے عالمِ ابد" الظاھر" سے عالمِ جسمانی، اور "الباطن" سے عالمِ رُوحانی کا قیام ہے۔

مذکورہ حقائق و معارف کی روشنی میں معلوم ہو جاتا ہے کہ دین کے بنیادی قوانین چار ہیں، یعنی قانونِ ازل، قانونِ ابد، قانونِ جسم (مادّہ)

اور قانونِ رُوح، جیسے قلم، لوح، ناطقؑ اور اساسؑ ہیں۔ اب ہم اِنشاءاللہ اس موضوع سے متعلّق سوال وجواب سے کام لیتے ہیں۔

سوال ۱: امامِ مستقرّ اور امامِ مُستودع میں کیا فرق ہے؟ امامِ مُستودع کا عمل کب سے شروع ہُوا؟ کیا ہر زمانے میں امامِ مُستودع کا ہونا ضروری ہے؟ امامت کے ان دو درجوں میں کیا حکمت پوشیدہ ہے؟

جواب: مذکورہ دونوں اماموں کے درمیان فرق یہ ہے کہ امامِ مُستقر دینی بادشاہ کی حیثیت سے ہر زمانے میں موجُود و حاضر ہوتا ہے، اور اس کا سِلسِلہ ہمیشہ جاری ہے، اس کے برعکس امامِ مستودع صرف اُس زمانے میں ہوتا ہے جبکہ بحکمِ خدا امامِ مستقر حجاب سے کام لینا چاہتا ہے، امامِ مستودع کا عمل حضرت اسحاقؑ ابنِ حضرت ابراہیمؑ سے شروع ہُوا، امامِ مستودع کا ہر زمانے میں ہونا ضروری نہیں، امامت کے ان دو درجوں میں کئی عظیم حکمتیں ہیں، اور اُن میں سے ایک حکمت یہ ہے کہ جس طرح اِنسانی رُوح کے دو سرے ہیں، دو انائیں ہیں، اور وہ بیک وقت عالمِ علوی میں بھی ہے اور عالمِ سفلی میں بھی، پس اسی حقیقت کی طرف علمی اور عملی رہنمائی اور اِشارہ کی غرض سے نُورِ امامت کے یہ دو شخصی ظہور ہیں۔

سوال ۲: بنو ہاجرہ جو آنحضرتؐ کے آبا و اجداد تھے، اُن میں ائمۂ مستقرین کا سِلسلہ ہمیشہ کے لئے چلتا رہا، اور حضرت خاتم الانبیاء صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم بھی اِسی پاک خاندان سے پیدا ہوئے، حالانکہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے اپنی ذُرّیت میں سِلسِلۂ امامت کے جاری و باقی رہنے کے لئے جو دُعا کی تھی (۲: ۱۲۴)، وہ بنو ہاجرہ اور بنو سارہ دونوں کے حق میں کی گئی تھی، پھر حضرت اسماعیلؑ کی اِس فضیلت و فوقیّت کا کیا سبب ہے کہ آپ کی نسل میں ہمیشہ

رُوحانی سلطنت کا سلسلہ چلتا رہا، جس کا ذکر قرآن پاک (۵۴/۴) میں موجود ہے؟

جواب: حضرت اسماعیلؑ ابن حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کے فضائل میں سے چند اس طرح ہیں:

۱۔ حضرت اسماعیلؑ ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے کہ خداوند تعالیٰ نے ان کو "غُلام" حلیم (۱۰۱/۳۷) جیسے پیارے نام سے یاد فرمایا، جس کا مطلب ہے تحمّل والا لڑکا۔

۲۔ آپ سے راہِ خدا میں قربان ہو جانے کے لئے فرمایا گیا، جس پر آپ بصد شوق تیار ہو گئے (۱۰۲/۳۷) جس کے نتیجے میں خداوندِ مہربان نے آپ کو محسنین میں شمار کیا۔

۳۔ آپ کو اپنی والدۂ محترمہ کے ساتھ بی بی سارہ نے گھر سے نکلوا دیا۔

۴۔ آپ کے حق میں والدِ بزرگوار کی دُعا اور والدۂ مکرّمہ کی فریاد قبول ہوئی، اور ہر قسم کی قبولیت کے معنی آپؑ کے مُبارک نام "اسماعیل" میں موجود ہیں، کیونکہ فرشتہ نے عبرانی میں کہا: شماعِ ایل" شماع (سماع = سُننا) ایل (خُدا) کے لفظی معنی ہیں خدا کا سُننا۔

۵۔ جناب اسماعیلؑ نے اپنے عظیم باپ کے ساتھ تعمیرِ بیت اللہ کی سعادت حاصل کر لی۔

۶۔ مُقدّس باپ بیٹے سے اللہ تعالیٰ نے خانۂ کعبہ کی صفائی و پاکیزگی کا عہد لیا (۱۲۵/۲) اس کا مطلب یہ ہے کہ آپؑ کچھ آگے چل کر اپنے والدِ محترم کے جانشین ہونے والے تھے۔

ے حضرت اسماعیلؑ اپنے عالی قدر باپ کی کئی دعاؤں میں ساتھ تھے، خاص کر ایسی دعاؤں کی بات ہے، جو ان دونوں مقدّس ہستیوں کی نسلِ آئندہ کے عروج و ارتقاء کے لئے خاص تھیں، پس یہی وجہ ہے کہ آپؑ کی نسل سے حضورِ انورؐ کا ظہور ہوا، اور ائمۂ مستقرؑ کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے چلتا رہا۔

سوال ۴۳ : امامِ مستقرؑ پر امامِ مستودع کس طرح حجاب ہوتا ہے؟ کیا ایک امام دوسرے امام کیلئے پردے کا کام دے سکتا ہے؟ اگر یہ درست ہے تو اسمائے الٰہی اور سُنّتِ خدائی کی کوئی مثال پیش کر کے ثابت کیا جائے۔

جواب : اس بارے میں خدا کے ناموں سے ثبوت یہ ہے کہ جہاں اللہ پاک کا ایک اسم "الظاھر" ہے وہاں اس کا دوسرا اسم "الباطن" ہے، چنانچہ الظاہر امامِ مستودع کی دلیل ہے، اور الباطن امامِ مستقرؑ کی دلیل، اور خدا کی سُنّت و عادت سے اِس حقیقت کا ثبوت یہ ہے کہ وہ جلّ شانہٗ جب کسی بشر سے کلام کرتا ہے، تو اس وقت حجاب کے پیچھے سے کلام کرتا ہے، اور جب اِشارۂ خاص (وحیٔ خاص) کرنا چاہتا ہے، تو اُس حال میں ظہور فرما ہو جاتا ہے (۴۲/۵۱) اس کے علاوہ قرآن کی مثال یہ ہے کہ اس کے الفاظ و کلمات معانی پر حجاب ہیں اور تنزیل پردہ ہے تاویل پر، نیز مثال حجاب ہے ممثول کا، حالانکہ یہ ساری چیزیں خود قرآن ہی ہیں، اِسی طرح ایک اعتبار سے امام خود اپنے آپ کا حجاب ہے، یعنی حقیقی نور پردۂ جسم کے اندر پوشیدہ ہے، جیسے سورج کے ظاہر میں باطن چھپا ہوا ہے۔

سوال ۴۴ : اس موضوع کا عنوان ہے "روحِ اسلام" اِس سے

اسلام کی کونسی چیز مُراد ہے؟ آیا دینِ اسلام کی واقعی کوئی زندہ رُوح موجُود ہے؟ یا اس سے دین کے وہ اساسی امُور مراد ہیں، جو اِنتہائی اہم ہُوا کرتے ہیں؟ اور جو دین کے جوہر کا درجہ رکھتے ہیں؟

جواب: دین کے اساسی اور انتہائی اہم امُور کی اہمیّت اپنی جگہ دُرست ہے، کیونکہ وہ دین کے جواہر ہی ہیں تاہم اِسلام کی ایک حقیقی رُوح بھی ہے، جو زمانۂ آدمؑ سے اِس طرف چلی آئی ہے (۱۵/۲۹، ۳۸/۷۲) وہ رُوح بھی ہے اور نور بھی (۴۲/۵۲) وہ ہمیشہ آسمانی کتاب کے ساتھ ہے (۵/۱۵) کیونکہ یہ اس کی جان ہے، یہ سچ ہے کہ کتابِ مُنیر دینِ خُدا کی رُوح اور نور ہے (۳/۱۸۴، ۲۲/۸، ۳۱/۲۰، ۳۵/۲۵) یہ دُرست ہے کہ رُوحِ اسلام کا ایک خاص نام سراج منیر ہے (۳۳/۴۶) اس میں کوئی شک نہیں کہ ہادئ برحق کا نور ہی رُوحِ اسلام اور نورِ اسلام ہے (۵۷/۲۸)

یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ دین جیسا ایک شریف ترین امر جمادات کی طرح بیجان ہو، یا اُس میں حیوان کی طرح ایک ادنیٰ رُوح ہو، یا اس میں ایک عام اِنسان کی رُوح ہو، چُنانچہ یہ ایک قرآنی حقیقت ہے کہ دین کی رُوح سب سے اعلیٰ ہے، اور اس کے ناموں میں سے ایک نام "رُوح الایمان" ہے یہ وقت آنے پر دِل میں داخل ہوجاتی ہے (۴۹/۱۴) جس سے دِل روشنیوں کی دُنیا بن جاتا ہے (۴۹/۷)، پس دین میں نہ صرف رُوحِ اعظم ہے بلکہ عقلِ کامل بھی ہے، اور وہ اسی رُوح و نُور سے الگ نہیں۔ الحمدُ للّٰہِ ربّ العلمین۔

غُلامِ غلامانِ امامِ زمانؑ

نصیر الدین نصیر ہونزائی

۲- دسمبر ۱۹۸۴ء

رُوح اور سائنس

عنوانِ بالا کا مقصد یہ ہے کہ رُوح کے چند حقائق و معارف سائنسی مُشاہدات کی روشنی میں پیش کئے جائیں، اور علمِ رُوح کی مدد سے سائنس کا تجزیہ کر کے دیکھا جائے کہ اس کی طاقت کا بُنیادی اور اصل سرچشمہ کیا ہے؟ رُوح اور سائنس (یعنی مادّہ) کے درمیان ربط و رشتہ کیا ہے؟ ان دونوں چیزوں کے مابین کوئی حدِ فاصل ہے یا نہیں؟ اگر نہیں (یا ہے) تو کس طرح؟ آفاق و اَنفُس کی آیات کیا ہیں؟ معرفتِ رُوح کے سلسلے میں سائنسی تمثیلات کس حد تک مُمِدّ و معاون ثابت ہو سکتی ہیں؟ آیا قرآنِ حکیم میں سائنس سے متعلق کوئی واضح تذکرہ یا کوئی حکیمانہ اِشارہ موجُود ہے؟ نزُولِ قرآن کے ساتھ ساتھ مُستقبل کے جن عظیم اِنقلابات کی پیش گوئی کی گئی تھی، اُن میں کہاں یا کس میں سائنسی انقلاب کا اشارہ موجُود ہے؟ کیا فرشتوں اور رُوحوں کے نزُول کو سب لوگ دیکھ سکیں گے؟ اِن جیسے سوالات سے یہاں بحث کی گئی ہے، کیونکہ آج کی دُنیا میں منشائے قدرت کے مطابق جیسے بعض صحیح اور مُفید علُوم و فنون

اوجِ کمال پر ہیں، اور جس طرح سائنسی عجائب و غرائب کا دَور دَورہ ہے، اس کی بدولت یہ بات پہلے سے کہیں زیادہ آسان ہوگئی ہے کہ رُوح و رُوحانیّت کے بارے میں سوچا جائے، اِس حقیقت سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں کہ اب سے تقریباً چودہ سو سال قبل آفاق و انفس کی جن آیات کے ظہُور کی پیش گوئی کی گئی تھی (۵۳/۴۱)، ان میں سے آفاقی آیات یعنی سائنسی عجائبات نے دُنیا میں رُونما ہوتے ہی ایک ظاہری اور مادّی قیامت برپا کر دی ہے، اور جب اس پیش گوئی کے دُوسرے معجزات یعنی رُوحانی عجائب و غرائب ظاہر ہوں گے، تو اس رُوحانی اِنقلاب یا قیامت سے احوالِ جہان بدرجۂ اِنتہا دگرگون ہوں گے۔

قیامت انفرادی ہو یا اجتماعی، جیتے جی ہو یا جسمانی موت کے بعد، بہرکیف اس کو اپنے وقت پر آنا ہی ہے، لہٰذا ہر مومن کی دانشمندی اِس بات میں ہے کہ وہ اس کے لئے خُود کو احکامِ خُداوندی کے مطابق تیار کر رکھے، خُودشناسی اور خُداشناسی کی طرف بھرپُور توجّہ دے، اور تین مقامات کی آیات میں غور و فکر کرے، اس سلسلے میں سب سے پہلے قرآنِ حکیم سے رجُوع اہلِ ایمان کی بہت بڑی سعادت ہے، پھر قرآنِ پاک ہی کے بہت سے ارشادات کے بموجب آفاقی آیات میں تدبُّر کا مرحلہ آتا ہے، تاکہ فطرت کے اندر جس طرح فاطِر (یعنی خالق) کی نشانیاں پوشیدہ ہیں، اور جیسی اس کی صفات کی طرف نشاندہی کی گئی ہے، اس سے آگہی ہو، چُنانچہ یہ حقیقت سب کے نزدیک مسلّمہ ہے کہ سائنس مُطالعۂ قُدرت اور مشاہدۂ

فطرت کی پیداوار ہے، پھر اس کے کامیاب اور مفید پہلو کو ہم کس طرح نظر انداز کر سکتے ہیں، جبکہ یہ خدا کی نشانیوں اور نعمتوں میں سے ہے (۴۱/۵۳ ، ۳۱/۲۰)

آیات کا تیسرا مقام عالمِ نفسی (یعنی عالمِ روحانی) ہے، جس سے روح و روحانیت مراد ہے، جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ عوالم یعنی دنیائیں تین ہیں: عالمِ دین، عالمِ ظاہر، اور عالمِ شخصی، ان میں سے ہر ایک بجائے خود اللہ کی ایک مکمل کتاب ہے، اسی وجہ سے ان تینوں میں آیات ہیں، آیت کے معنی نشانی بھی ہیں اور معجزہ بھی، پس عالمِ دین یعنی قرآنِ حکیم میں جو کچھ الفاظ و معانی میں ساکن اور یکجا ہے، وہ کائنات میں متحرک اور پھیلا ہوا ہے، اور عالمِ شخصی میں زندہ اور مجموع ہے۔

قرآنِ حکیم کے عظیم معجزات میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنے ظاہر و باطن کے وسیع معنی میں ہر چیز کا بیان کرنے والا ہے (۱۶/۸۹) اور اس حقیقت کو عملاً دیکھنے کے لئے نورِ ہدایت کی روشنی چاہیئے (۵/۱۵) اگر وہ روشنی حاصل ہے تو اللہ تعالیٰ کی اس پُرحکمت کتاب میں ہر چیز کا ضروری بیان موجود ہے، چنانچہ سائنس جیسی بڑی اہم چیز اور اس کے انقلاب کا اشاراتی تذکرہ نہ صرف بہت سی پیش گوئیوں میں فرمایا گیا ہے، بلکہ اس کے علاوہ اور بھی کئی عنوانات ہیں، جن کے تحت سائنسی ایجادات کی طرف بلیغ و رسا اشارے کئے گئے ہیں، مثال کے طور پر خدا تعالیٰ کا بار بار یہ اشارہ فرمانا کہ تم اس کائنات کی ہر چیز میں غور و فکر کرو، اس ہدایت میں انسان کی سعادتِ دارین پوشیدہ ہے، کیونکہ اس حکم کی تعمیل میں مادّہ اور روح

دونوں کی حقیقت جاننے کا امکان ہے، یعنی اس مطالعۂ قدرت (NATURE STUDY) میں ایک طرف سائنس سے آگہی کا فائدہ ہے اور دوسری طرف حصولِ معرفت کا۔

سورۂ انفعال کے ایک ارشاد (۸:۶۰) میں اسلام کی حفاظت و مدافعت کی تیاری کے سلسلے میں جس جامعیّت کے ساتھ حکم دیا گیا ہے، اس سے یہ حقیقت روشن ہو کر سامنے آتی ہے کہ آسمانی تائید کی بدولت جو بھی مادّی قوّت ممکن ہے، وہ سب سے پہلے اور سب سے اعلیٰ درجے پر مسلمانوں کے پاس ہونی چاہئے، پس ظاہر ہے کہ ایسی طاقت کی تحصیل صرف سائنسی ایجادات ہی کی صورت میں ہو سکتی ہے۔

یہاں اِس امر سے بحث مقصود نہیں کہ ہم مسلمانوں نے دوسروں کے مقابلے میں سائنسی اعتبار سے کتنی ترقّی و پیشرفت کی ہے، یا کِس قدر پیچھے رہ گئے ہیں، اور اس کے اسباب و عِلل کیا ہیں، لیکن ہم سب کو اس حقیقت کی طرف توجّہ دینے کی شدید ضرورت ہے، کہ سائنسی فکر و عمل کے نتیجے میں جو عجیب و غریب آلات اور ان کے گوناگون کرشمے سامنے آئے ہیں، وہ نہ صرف ظاہری اور مادّی نقطۂ نظر سے مفید ہیں، بلکہ ان کا سب سے بڑا فائدہ باطنی اور روحانی قسم کا ہے، وہ یہ کہ ان میں رُوح و رُوحانیّت کی ایسی بہت سی تمثیلات و تشبیہات موجود ہیں، جن کی روشنی میں غور و فکر کر کے ہر دانشمند رُوح سے متعلّق علم الیقین کو حاصل کر سکتا ہے کیونکہ اللہ تعالےٰ نے جس طرح ان چیزوں کو اپنی آیات کا درجہ دیا ہے، اس کی خاص غرض

یہی ہے، اور آیات کے معنی یہاں معجزات ہیں، جیسا کہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْۤ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (۴۱: ۵۳) ہم عنقریب ان کو اپنے معجزات دُنیائے ظاہر میں بھی دکھائیں گے اور خود ان کی جانوں میں بھی یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے کہ وہ (یعنی خدا) حق ہے۔ اِس ربّانی تعلیم میں، جو مادّہ اور رُوح کی حکمتوں سے مملو ہے، نہ صرف اِمروز کی سائنسی ترقّی کی پیش گوئی اور فردا کے رُوحانی انقلاب کی خوشخبری ہے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ یہ اشارہ بھی ہے کہ پہلے پہل سائنسی معجزات کا ظہور ہوگا، اور اس کے بعد رُوحانی معجزات کا دَور آئے گا، تاکہ لوگ ان ظاہری و باطنی عجائب و غرائب کے سِلسلے میں غور و فکر کرتے ہوئے خود شناسی اور خداشناسی کی سعادت حاصل کر سکیں۔

یقیناً رُوح عالمِ امر (یعنی کلمۂ کُن) سے ہے، اِس لئے وہ حقیقت بے مثال ہے، تاہم اِس مادّی دُنیا میں بقدرِ امکان کوئی ایسی ظاہری چیز رُوح کی مثال ہو سکتی ہے، جو بہت سی اعلیٰ خصوصیات کی وجہ سے مادّیت کی چوٹی پر ہو، جو سب سے لطیف، سریع الحرکت، اور ہمہ رس ہو، جس میں ایک طرف وحدت اور دُوسری طرف کثرت کا نمونہ پایا جائے، جو رُوح کے گوناگون ظہُورات کی مثال کو پیش کر سکے، جو دکھائی دے اور نہ دکھائی دے، جو جسم کو چھوڑ کر اس کی صورتِ لطیف کو پیش کر سکے، جس میں ہر قسم کی آواز اور گفتگو محفوظ ہو سکے، جس کے ذریعہ دُور دُور بیٹھے ہوئے لوگ

آپس میں گفت و شنید کر سکیں، جو بلندیوں میں اُڑتا اور اُڑاتا پھرے، جو زندہ چیزوں کی متحرّک عکّاسی کرے، اور ان کے ماضی کو حال بنائے، جو سمعی اور بصری اشیاء کی ایک کائنات کو بنائے، جو باغ و گلشن کے حسین منظر کو سدا بہار محفوظ کر لے، جو ذرّۂ بے مقدار کو آفتاب بنا کر اور آفتاب کو ذرّے کے مُشابہ کر کے دکھائے، اور جو ہر اعتبار سے عجائب و غرائب اور علم و فن کی ایک ایسی جدید دُنیا ہو، کہ قبلاً اس کی کوئی مثال نہ ملے، جی ہاں، یقیناً ایسی انتہائی عجیب شئے سائنس ہے، جس میں دُوسری مادّی چیزوں سے بڑھ چڑھ کر، اور بڑی عُمدگی کے ساتھ رُوح کی مثالیں موجُود ہیں، پس اہلِ دانش پر واجب ہے کہ وہ اس میں چشمِ بصیرت سے دیکھیں کہ دراصل یہ اللہ تعالیٰ کے اُن معجزات میں سے ہے، جن کے دکھانے کی پیش گوئی نزُولِ قرآن کے زمانے میں کی گئی تھی، اور اُن کا اعلیٰ ترین مقصد رُوح شناسی ہے، جس میں خُدا شناسی ہے۔

"رُوح اور سائنس" کے اس اہم ترین موضوع کے سلسلے میں یہ ایک بُنیادی سوال سامنے آتا ہے کہ آیا رُوح اور مادّہ حقیقت میں دو الگ الگ چیزیں ہیں؟ اگر کہا جائے کہ ہاں، تو پھر سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان حدِّ فاصل کیا ہے یا کون سی شئے ہے، جو ان دونوں چیزوں کو ایک دُوسرے سے قطعاً جُدا کر دے؟ کیا اس کے برعکس یہ ممکن ہے کہ ان دونوں کا رشتۂ وجُود (یعنی ہستی کا دھاگا) ہمیشہ اور ہر مقام پر متّصل اور اٹوٹ ہو؟ اس کے بارے میں میری

گزارش یُوں ہے کہ رُوح اور جسم یعنی مادّہ اگرچہ ظاہراً الگ الگ دو چیزیں ہیں، لیکن بحقیقت یہ ایک ہی چیز ہے، جس کی یہ دو صُورتیں ہیں، وہ واحد شئی وجود (ہستی) ہے، اور اس کی یہ دونوں شکلیں تحلیل و انجماد کے نام سے ہیں؛ اس کا واضح مطلب یہ ہُوا کہ پتّھر ہو یا لوہا، جو منجمد ہونے کی وجہ سے جماد کہلاتا ہے، اس کی تحلیل نباتات، پھر حیوانات، پھر انسان میں ہو سکتی ہے، اور ان کی تحلیل انسان میں براہِ راست بھی ہو سکتی ہے، اس کی ایک روشن دلیل یہ ہے کہ بعض مُقوّی غذاؤں کا ایک اہم عُنصر فولاد ہوتا ہے، نیز نہ صِرف یُونانی طب میں، بلکہ ڈاکٹری میں بھی بعض دواؤں میں فولاد ملا دیا جاتا ہے، اسی طرح بعض خاص پتّھروں اور اُن جیسی جامد چیزوں کو بھی بطورِ دوا استعمال کرتے ہیں، اس کے یہ معنی ہُوئے کہ پتّھر اور لوہے کی تحلیل سب سے پہلے رُوحِ حیوانی کی صُورت میں ہو جاتی ہے، اور اس کے بعد رُوحِ انسانی میں۔

ہم اس اصُول کو تسلیم کر لیتے ہیں کہ ہر قسم کے مادّہ میں کوئی نہ کوئی رُوح پنہاں ہُوا کرتی ہے، مثلاً بیدار و متحرک رُوح، نیم بیدار (نیم خوابیدہ)، خوابیدہ، نیم مُردہ، مُردہ، نیم منجمد، منجمد رُوح، وغیرہ، تاکہ کارخانۂ قُدرت چلتا رہے، اور نظامِ کائنات و موجُودات قائم ہو۔

اِس سِلسلے کی وجہ آیۂ مبارکہ جو کلیدی حکمتوں سے مملو ہے، یہ ہے:

قُلْ كُونُوا حِجَارَةً أَوْ حَدِيدًا (۱۷: ۵۰)۔ ان سے کہو "تم پتّھر ہو جاؤ یا لوہا"۔ اِس ارشاد میں کیا کیا حکمتیں پوشیدہ ہیں؟ کیا اِس امر کا تعلّق

آسمان سے ہے یا زمین سے؟ یا دونوں سے ہے؟ کیونکہ پتھر اور لوہا دونوں جگہ موجود ہیں، بہر حال جب اللہ تعالیٰ نے چاہا، اور اپنے رسولِ کریمؐ کی زبانِ پاک سے "کونوا" فرمایا تو یقیناً ان لوگوں کے ذرّاتِ روح پتھر یا لوہا بن گئے، جیسے سورۂ بقرہ (۲/۶۵) میں ارشاد ہے: ..... کُونُوا قِرَدَةً خٰسِئِينَ (۲/۶۵) اور اپنی قوم سے اُن لوگوں کی حالت تو تم بخوبی جانتے ہو جو شنبہ کے دن اپنی حد سے گزر گئے تو ہم نے ان سے کہا کہ تم ذلیل بندر بن جاؤ۔ یہ لوگ بنی اسرائیل میں سے تھے، جنھوں نے سنیچر کے دن مچھلیوں کا شکار کر کے نافرمانی کی تھی، اللہ تعالیٰ کا ان سے یہ فرمانا کہ "تم ذلیل بندر بن جاؤ" حضرت داؤد علیہ السّلام کی زبان کے توسط سے تھا (۵/۷۸) اور اس امر کے بموجب ان لوگوں کے ذرّاتِ رُوح بندر بن گئے تھے، مذکورہ دونوں مثالوں سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ ہادیٔ زمان خُدا کی زبان ہُوا کرتا ہے۔

سورۂ لقمان (۳۱/۱۶) میں ارشاد ہے: یٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ (۳۱/۱۶)، اور (لقمان نے کہا تھا) بیٹا اگر کوئی چیز رائی کے دانہ برابر بھی ہو پھر وہ کسی چٹان کے اندر ہو یا آسمانوں میں یا زمین میں کہیں چھپی ہوئی ہو اللہ اسے نکال لائے گا، یہ آسمان زمین کی ہر ہر چیز میں ذرّۂ روح موجود ہونے اور انفرادی قیامت میں ایسے تمام ذرّات کے محشور ہونے کی ایک مثال ہے۔

اس وسیع و عریض کائنات کی ایک عظیم الشان روح ہے، جس کے

کئی نام ہیں، جیسے کرسیٔ خدا (۲/۲۵۵)، نفسِ واحدہ (۶/۹۸، ۳۱/۲۸) جنّت (۳/۱۳۳، ۵۷/۲۱) لوحِ محفوظ (۸۵/۲۲) رُوحِ قرآن (۴۲/۵۲) سماء (آسمان، ۶/۶) نفسِ کُلّی، رُوحِ ارواح، رُوحِ اعظم، عالمگیر رُوح یا کائناتی رُوح، وغیرہ، یہ نُکتہ انتہائی اہم ہے کہ ہم سب کرسی یعنی کائناتی رُوح کی شکل کا تصوّر کریں، کہ کرسی کائنات اور اس کی ہر چیز کے ظاہر و باطن سے وابستگی کی وجہ سے کائنات ہی کی طرح گول ہے، یعنی عالمگیر رُوح کا سمندر، جس میں دُنیائے ظاہر ڈُوبی ہُوئی ہے، گول شکل رکھتا ہے، مگر اب یہ جاننا باقی ہے کہ کائنات بحرِ رُوح میں کس طرح غرق ہو گئی ہے؟ کیا اُس پتّھر کی طرح جو پانی میں ڈُوب جاتا ہے؟ نہیں نہیں، کیُونکہ پتھر تو بے شک پانی میں ڈوب جاتا ہے، مگر اس کے باطن میں پانی داخل نہیں ہو سکتا، اس کے برعکس یہاں سارا عالم رُوح کے سمندر میں مستغرق ہے، وہاں ہر ذرّہ ظاہراً و باطناً رُوح کی لپیٹ میں ہے، جس طرح مٹّی کی کوئی ایسی اینٹ جو پانی میں ڈالی گئی ہو، اور اس کے ظاہر و باطن میں پانی ہی پانی چھا جائے، یا اس مثال کو یُوں سمجھ لیں کہ لوہے کا ایک بڑا سا گولہ ہے، جس کو لوہار نے بھٹّی میں سُرخ انگارا بنا دیا ہے، اب آپ ہی بتائیے کہ اِس گولے کے ہر ذرّے میں آگ ہے یا نہیں؟ اور تمام گولہ کس طرح آگ میں ڈوب گیا ہے؟ اِس مثال سے یہ حقیقت روشن ہو کر سامنے آئی، اور ذرا بھی شک باقی نہ رہا کہ آسمان زمین میں ہر طرف، ہر جگہ، اور ہر چھوٹی بڑی چیز کے اندر باہر روح محیط ہے۔

اگر روح کا تصوّر جسم (مادّہ) کے بغیر کیا جائے، تو اُس حال میں یہ

کہنا درست نہیں ہوگا کہ رُوح کا سمندر گول ہے، یا کسی اور شکل کا ہے، کیونکہ رُوح پر، جبکہ مُجرّد ہو، اَبعادِ ثلاثہ (طول، عرض، عُمُق) کا اطلاق نہیں ہوتا ہے، مگر جہاں اس کی وابستگی عالمِ جسمانی سے ہے، وہاں یہ بات حقیقت ہے کہ رُوحِ کُلّی کا سمندر اس کائناتِ ظاہر ہی کی طرح گول ہے، اور یہی سمندر جو بحرِ رحمت ہے بہشت بھی ہے، جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا کہ جنّت کی عرض (چوڑائی، یعنی وُسعت) کائنات کی عرض کے برابر ہے (۳/۱۳۳، ۵۷/۲۱)

سوال: آپ نے کہا کُرسی یعنی عالمگیر روح جو بحرِ رحمت بھی ہے اور جنّت بھی، اس کی شکل اس کائنات کی طرح گول ہے، لیکن ہم کو کیسے یقین آئے کہ عالمِ ظاہر یعنی یہ مادّی کائنات گول ہے؟ کیا آپ اِس سلسلے میں کوئی ٹھوس دلیل پیش کر سکتے ہیں؟

جواب: دلیل ۱: جب خُداوند تعالیٰ نے فرمایا کہ جنّت کی عَرض (چوڑائی، ۳/۱۳۳، ۵۷/۲۱) آسمان وزمین یعنی کائنات کی چوڑائی کے برابر ہے، تو اس میں اُس دانائے مطلق نے بہشت کی لمبائی اور گہرائی کا کوئی ذِکر نہیں فرمایا، کیونکہ وہ بھی اور یہ جہان بھی گول ہے، اور گول چیز کی جو کچھ چوڑائی ہوتی ہے، وہی اس کی لمبائی بھی اور گہرائی بھی شمار ہوتی ہے، یہی سبب تھا، کہ خُدائے علیم وحکیم نے جنّت اور کائنات کی صِرف عَرض کا ذکر فرمایا، اور طول وعُمُق کے بارے میں کچھ ارشاد نہیں کیا گیا، پس اِس دلیل سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ کائنات اور عالمگیر رُوح کی شکل گول ہے۔

دلیل ۲: اس کائنات کا ہر سیّارہ اور ستارہ جب وجود میں آیا، تو وہ گول شکل میں تھا، اور اب بھی ایسا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ گول کائنات کی گول حرکت کے زیرِ اثر پیدا ہوا ہے، نیز ان میں سے ہر ایک جس طرح ایک دائرے میں گردش کرتا ہے، اس کا سبب بھی یہی ہے، کہ وہ کائناتی گول گردش کے دھکے میں ہے (۲۱/۳۳، ۳۶/۴۰)

دلیل ۳: سورج کا سرچشمہ جو کائنات کے مرکز یعنی وسط میں واقع ہے، وہ ہر طرح سے گول ہے، یہ روشن گیس کی ایک بہت بڑی طوفانی دنیا ہے، جہاں عالمگیر روح کے دباؤ سے ایتھر (ETHER) کی تحلیل ہو کر روشنی کا انتہائی عظیم ذخیرہ بن جاتا ہے، اور اس کی شکل گول اس لئے ہے، کہ یہ گول کائنات اور گول عالمگیر روح کی گول گرفت میں ہے۔

دلیل ۴: کائنات کی جو اصل ہے، اس کا تصوّر مُدوّر (گول) ہے، اور وہ اصل لؤلوئے مکنون ہے، جس سے کائنات پیدا کی گئی ہے، اور جب جب اللہ تعالیٰ اپنے دستِ قدرت میں کائنات کو لپیٹ لیتا ہے تو اس کے نتیجے میں پھر وہی لؤلؤ حاصل آتا ہے (۳۹/۶۷، ۲۱/۱۰۴) پس ان دلائل سے اس حقیقت کا کامل اور مکمل یقین ہو گیا کہ کائنات یعنی جسمِ کُلّی پوری طرح گول ہے۔

جس طرح پانی مختلف حالتوں میں پایا جاتا ہے، جیسے سمندر، بخارات، بادل، برف، بارش، شبنم، یخ، چشمہ، کنواں، کاریز، نہر، ندی، دریا، وغیرہ، اسی طرح فرشتہ ہو یا روح، اس کے مختلف حالات و درجات ہوا کرتے

ہیں، مثال کے طور پر وہ ایک عقلی نور ہے، وہ ایک رحمانی صورت ہے، وہ ایک جامع الجوامع کلمہ ہے، وہ ایک نورانی آواز ہے، وہ ایک روشنی ہے، وہ ایک لطیف بشری ظہور ہے، وہ ایک صاعقہ (کڑکنے اور زمین پر گرنے والی بجلی) ہے، وہ ایک رعد (بادل کی گرج) ہے، وہ ایک برق (آسمانی بجلی) ہے، وہ ایک مجموعۂ ذرّات ہے، وہ ایک تجلّی ہے، وہ ایک علمی دُنیا ہے، وہ ایک بہشت ہے، اور اس کی کم سے کم شعاعوں کا ادراک حُسنِ توفیق، نیک خیال اور ایجادی وفنّی سمجھ بُوجھ کی صُورت میں بھی ہو سکتا ہے، جیسا کہ قرآنِ پاک کا ارشاد ہے:۔

فالھمھا فجورھا وتقوالھا (۹۱/۸) پھر اس (یعنی جان) کی بدکرداری اور پرہیزگاری (دونوں باتوں) کا اس کو اِلقاء کیا۔

سب لوگ اِس حقیقت کو قبُول کرتے ہیں کہ بُرے خیالات شیطان سے ہیں، پھر دُوسری طرف سے بھی اسی طرح ماننا ہوگا کہ اچھّے خیالات فرشتے کے توسّط سے ہیں، اس کا نتیجہ بڑی صفائی کے ساتھ یہ نکلا کہ سائنسدانوں نے غور و فکر کے بعد جو کچھ دُنیا والوں کو دیا، وہ دراصل خزائنِ الٰہی میں تھا، جسے خُدا تعالیٰ نے فرشتوں اور رُوحوں کے ساتھ نازل فرمایا، اور اُن سے سائنس والوں نے غیر شعوری کیفیّت میں یہ ساری چیزیں حاصل کرلیں۔

وہ بابرکت شبِ قدر جو ہر سال رمضان المبارک میں واقع ہوتی ہے جس میں جملہ امور سے متعلّق فرشتوں اور روحوں کا نزول ہوتا ہے، لیکن جو کچھ لایا جاتا ہے اور جو کچھ دیا جاتا ہے، اس سے کوئی شخص آگاہ نہیں

ہوتا، یہ علامت اور مثال ہے، اور اس کا ممثول "دورِ شبِ قدر" ہے، جو بہت ہی عظیم ہے، اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ سب سے مُبارک رات آچکی ہے اور نزولِ ملائکہ و ارواح بھی ہو چکا ہے، تو کیا خُدا تعالیٰ کے نزدیک یہ بات ضروری ہے کہ اس واقعہ کی خبر سب لوگوں کو ہو؟ جب کہ رات کی تاویل باطن، پوشیدگی اور رُوحانیّت ہے؟ اور فرشتوں نے بادلوں کے اوٹ میں اُترنا تھا (۲/۲۱۰، ۲۵/۲۵)؟ مگر ہاں، یہ صحیح ہے کہ اس عظیمُ الشّان روحانی انقلاب میں جن امور کا تعلّق دُنیائے ظاہر سے ہے، ان کی مادّی صورتیں ظہور پذیر ہوتی جا رہی ہیں، اور یہی چیزیں سائنسی ایجادات کہلاتی ہیں۔

اگر آج نہیں تو کل ضرور یہ راز سائنسدانوں پر روشن ہو جائے گا کہ سائنس رُوحانی انقلاب کا پیش خیمہ ہے، اور یہ سارے اکتشافات ایک عظیمُ الشّان آسمانی پروگرام (PROGRAMME) کے تحت ہوتے جا رہے ہیں، تا آنکہ اسرارِ روح و روحانیّت ظاہر ہونے لگیں گے، اور اللہ تعالیٰ کے ارشادات کے مطابق دُنیا میں سب سے بڑی تبدیلی رُونما ہو جائے گی۔

سائنس کا سارا نظام "رُوحِ مُسخّر" پر قائم ہے، جیسا کہ سورۂ جاثیہ (۴۵/۱۳) میں ارشاد ہُوا ہے: اور اُس نے آسمانوں اور زمین کی ساری چیزوں کو تمھارے لئے مُسخّر کر دیا، سب کچھ اپنے پاس سے۔ اِس سے ارواحِ سماوی و ارضی کی تسخیر مراد ہے، کہ ظاہراً سائنسی نتائج و ثمرات کی صُورت میں ہے اور باطناً روحانی سلطنت کی شکل میں۔

سورۂ حجر (۱۵/۲۱) میں ارشاد فرمایا گیا ہے: وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ (۱۵/۲۱) اور کوئی چیز (اس قانون سے باہر) نہیں مگر اس کے خزانے ہمارے پاس ہیں اور ہم اس کو نازل نہیں کرتے ہیں مگر دانستہ مقدار میں۔ اس آیۂ مبارکہ میں بار بار غور و فکر کرنا چاہیئے تاکہ اس سے بیش از بیش علمی برکتیں حاصل ہو جائیں، چنانچہ ہم سب سے پہلے عِنْدَنَا" کے بارے میں سوچتے ہیں کہ عندی (میرے پاس) کی جگہ عِنْدَنَا (ہمارے پاس) کیوں فرمایا گیا ہے؟ اس میں کیا راز ہے؟ دوسرا سوچنا یا پوچھنا یہ ہے کہ ایک چیز کے کئی خزانے کیوں ہیں؟ ایک خزانہ کیوں نہیں؟ تیسرا سوال ہے کہ اس آیۂ مقدسہ کے مطابق کوئی چیز کب دنیا میں نازل ہوتی ہے؟ کیا ہر زمانے میں اور ہر وقت؟ یا یہ کسی خاص زمانے کی بات ہے؟ اور چوتھا سوال یہ ہے کہ دانستہ مقدار سے کیا مراد ہے؟ آیا اس میں علمِ الٰہی کا ذکر ہے یا انسانی معلومات کا؟ یا دونوں کا تذکرہ ہے؟

اس سلسلے میں میری انتہائی عاجزانہ گزارش یہ ہے کہ اس آیۂ حکمت آگین کی ایک تاویل کتاب "گنجِ گرانمایہ" میں موجود ہے، یہاں ایک اور تاویل بیان کی جاتی ہے، کہ قرآنِ حکیم میں جب اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا کوئی ذکر مقصود ہوتا ہے، تو اس میں لازمی طور پر ہمیشہ ذاتِ یکتا کے لئے ضمیر واحد آتی ہے، لیکن جس وقت کسی خدائی فعل کا تذکرہ کرنا ہوتا ہے، تو اس صورت میں اکثر ضمیرِ جمع استعمال کی جاتی ہے، اس کی وجہ یہ

ہے کہ باری سُبحانہٗ کے لئے جس طرح امر خاص ہے، اس طرح فعل خاص نہیں کیونکہ وہ بادشاہِ مطلق ہے، لہٰذا اس کے حُکم کے تحت عظیم فرشتے یعنی قلم، لوح، اسرافیل، میکائیل، جبرائیل، نُورِ نبوّت، اور نُورِ امامت کام کرتے ہیں، چُنانچہ خدائے پاک و برتر نہ صرف ان فرشتوں کے اس کام کو اپنی ذاتِ اقدس سے منسوب کرلیتا ہے، بلکہ خُود ان پاکیزہ ہستیوں کو بھی اپنائیت سے سرفراز کرکے فرماتا ہے کہ: "یہ کام ہم نے کیا"، یہی حقیقت مذکورۂ بالا آیت میں موجُود ہے، سو اللہ تعالیٰ نے لفظ "عِنْدَنا" میں اپنے زِندہ خزانوں کو اپنایا ہے، اور ان کے قُرب کو اپنے قُرب کا درجہ دیا ہے، ورنہ مکان و لامکان میں کوئی ایسی حد نہیں جس کے متعلّق کہا جائے کہ خدا کی نزدیکی یہ ہے۔

مذکورہ چیز سے اِنسان مراد ہے، جس کیلئے تین بنیادی خزانے چاہیئیں یعنی عقلی، روحانی اور جسمانی، جو قلم، لوح، اور انسانِ کامل (پیغمبرؑ یا امامؑ) ہیں، دوسرے لفظوں میں یہی خزانے عالمِ عقل، عالمِ روح، اور "عالمِ ذر" کہلاتے ہیں، ان خزانوں سے بحکمِ خدا ہر وقت چیزیں آتی رہتی ہیں، مثال کے طور پر آدمیوں کے پیدا ہو جانے کا سلسلہ جاری ہے، اس میں سب سے پہلے ذرّۂ جسم کو آنا چاہیئے، پھر روح اور اسکے بعد عقل آتی ہے، ہر آنے والی چیز کی "دانستہ مقدار" میں دونوں اِشارے موجود ہیں۔

مذکورۂ بالا قرآنی قانون کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہوگئی، کہ موجُودہ سائنس کے تینوں اجزاء: عقل (علم)، رُوح، اور مادّہ پہلے پہل خُدا کے خزانوں میں تھے، وہاں سے یہ چیزیں خُداوند تعالیٰ کے علم یعنی پروگرام اور سائنسدانوں کی معلومات کے مطابق دُنیا ئے ظاہر میں آگئیں

تاہم اس میں شاید ایک بات سے آپ کو بڑا تعجب ہُوا ہوگا، کہ مادّہ جو اس کائنات میں آزاد اور بکھرا ہُوا ہے، وہ اللہ کے کسی خاص خزانے میں گھرا ہُوا اور لپیٹا ہُوا کیسے ہوسکتا ہے؟ ہاں یہ حیرت یا سوال ممکن ہے، مگر عالمِ ذرّ کے حقائق کے متعلّق جس قدر آپ کے علم الیقین میں اضافہ ہوگا، اس قدر یہ حیرت کم ہوگی، اور جُوں جُوں آپ قرآنی اور رُوحانی حکمت سے واقف و آگاہ ہوتے جائیں گے، تُوں تُوں آپ کے سامنے یہ حقیقت روشن ہوتی جائے گی، کہ مادّۂ لطیف (عالمِ ذرّ) رُوحِ قُدسی اور عقلِ کامل یہ تینوں ایک ساتھ دستِ قُدرت میں جمع و یکجا ہیں (۲۱/۱۰۴، ۳۹/۶۷) دستِ قُدرت یعنی اللہ کا ہاتھ بفرمودۂ قرآن (۴۸/۱۰) سب سے پہلے رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی ذاتِ بابرکات ہے، اور پھر بحکمِ خُدا آپؐ کے جانشینوں میں سے ہر ایک اپنے زمانے میں دستِ خُدا ہے، چُنانچہ ایسے شخصِ کامل و مکمّل کا ایک معجزاتی جسمِ لطیف ہُوا کرتا ہے، جو عالمِ ذرّ کہلاتا ہے، جس کے بہت سے قرآنی نام ہیں، ان میں سے چند اسماء یہ ہیں:۔

سِربال (کُرتہ) جس کی جمع سَرابیل ہے (۱۶/۸۱) لَبُوس (پوشش، ۲۱/۸۰) صاعِقہ (۱۳/۱۳) رَعد (۱۳/۱۳) برق (۱۳/۱۲) الکوثر (۱۰۸/۱) جسمِ بسیط (۲/۲۴۷) بشرِسَوِیّ (۱۹/۱۷) وغیرہ، اس معجزاتی جسم میں نہ صرف مادّی سائنس کے ہرگونہ ذرّات موجود ہیں، بلکہ جسدِ ابداعی ہونے کی وجہ سے رُوحانی سائنس کے لاتعداد عجائب و غرائب اور معجزات بھی ہیں، مثال کے طور پر آپ نے سُنا ہوگا، کہ آج کل جن

ممالک میں ظاہری سائنس کا دَور دَورہ ہے، وہاں فضا میں بعض دفعہ اُڑن طشتریاں نظر آتی ہیں، جو ابھی تک سائنس دانوں کے نزدیک ناشناختہ چیزیں ہیں، جو حقیقت میں مادیّت اور رُوحانیّت کے سنگم پر ہیں، اور اُن میں بے شمار حکمتیں پوشیدہ ہیں، اگر آپ چاہیں تو اُن کے بارے میں غور و فکر کر کے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں، کیونکہ اُن کا ظہور ایک انتہائی عظیم رُوحانی انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔

ایک عظیم اور زبردست رُوح کس طرح عالمِ ذرّ ہُوا کرتی ہے، جسمِ لطیف یا ایتھر (ETHER) کو کس آسانی سے برقی توانائی میں تبدیل کر سکتی ہے، اور اس سے مستقبل کی رُوحانی سائنس کے متعلّق کیا کیا اُمیدیں وابستہ ہو سکتی ہیں، اس کی مثال آپ یو۔ ایف۔ او (U.F.O.) یعنی اُڑن طشتری سے لے سکتے ہیں، کیونکہ وہ منشائے الٰہی کے مطابق فعلِ ابداع یعنی نتائجِ "کُن" کا نمونہ ہے، لہٰذا ایک مخلوق ہونے کے باوجُود سب ہے، سو آپ کہہ سکتے ہیں، کہ وہ معجزاتی کُرتہ ہے، یا صاعقہ اور رعد و برق ہے، یا فرشتہ ہے، یا ترقّی یافتہ انسان ہے، یا جنّ ہے، یا کوکبی بدن ہے، یا عالمِ شخصی ہے، یا عالمِ ذرّ ہے، یا انسانِ کامل ہے، یا معجزۂ قیامت ہے، یا تاجِ عُلوی ہے، یا تختِ رُوحانیّت ہے، یا سلطنتِ سلیمانی ہے۔

نصیر الدین نصیر ہونزائی

۱۴۔ مارچ ۱۹۸۵ء

مِعراج اور مَعارِج

معراج کے معنی ہیں اُوپر چڑھنے کی چیز، سیڑھی، زینہ، نردبان' رسُولِ خُدا صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا عالمِ عُلوی میں نُورِ خُداوندی دیکھنے کا موقع اور اس کی جمع معارِج ہے، جیسے قرآن حکیم (۱-۷۰) میں ارشاد فرمایا گیا ہے:-

سَاَلَ سَآئِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ۔ لِّلْكٰفِرِينَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ۔ مِّنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ۔ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوحُ اِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِينَ اَلْفَ سَنَةٍ (۱-۷۰) ایک سائل نے ہونے والے (رُوحانی) عذاب کو مانگا جس کا کافروں کے واسطے کوئی دفع کرنے والا نہیں، یہ اللہ کی طرف سے واقع ہوتا ہے جو سیڑھیوں اور معراجوں کا مالک ہے، اس کی طرف فرشتے اور رُوحِ اعظم چڑھ کر جاتی ہے ایک ایسے دِن میں جس کی مقدار پچاس ۵۰ ہزار برس کی ہے۔

حکمت: (۱) یہ اصُول ہمیشہ کے لئے یاد رہے کہ ہر عظیم خُدائی بھید کا ایک گونہ حجاب ہُوا کرتا ہے، چُنانچہ یہاں پسِ پردہ ایک بہت بڑا راز ہے۔

(۲) عذاب دراصل راہِ رُوحانیّت پر واقع ہے (۱۹/۷) مگر اسے خُدائے مہربان مومنین سے دفع کرتا ہے، جیسا کہ آیۂ مذکورۂ بالا میں اشارہ ہے۔

(۳) مانگنے والے نے رُوحانی ترقّی مانگی تھی، وہ مومن تھا، مگر خُدا تعالےٰ نے بمقتضائے حکمت اس بات پر ایک مناسب پردہ بنایا، جس کا ذکر ہو چکا۔

(۴) انبیاء و أئمّہ علیہم السّلام خُدا تعالیٰ کی زندہ سیڑھیاں (معارج) ہیں، ان حضرات میں سے ہر ایک (جو رُوحِ اعظم کا درجہ رکھتا تھا) نے بحکم خُدا ارواحِ مومنین کو فرشتے بنا کر اللہ کی بارگاہِ عالی تک پہنچا دیا۔

(۵) اگرچہ رُوحانیّت کا یہ سفر دُنیاوی حساب سے ۵۰۰۰۰ (پچاس ہزار) برس کا ہے، لیکن اہلِ ایمان کا نُور جس طرح ان کے آگے اور داہنے دوڑتا ہے، اُس کی بدولت یہ مُسافت کم مُدّت میں طے ہو جاتی ہے (۵۷/۱۲، ۶۶/۸)

سُورۂ اعراف (۷/۴۰) کے اِس پُرحکمت ارشاد میں خُوب غور کرنا ہے:

انّ الّذین کذّبوا بایٰتنا واستکبروا عنها لاتفتّح لهم ابواب السّمآء ولا یدخلون الجنّة حتّی یلج الجمل فی سمّ الخیاط (۷/۴۰) یقین جانو جن لوگوں نے ہماری آیات کو جُھٹلایا ہے اور ان کے مُقابلہ میں بڑائی کی ہے ان کے لئے آسمان کے دروازے ہرگز نہ کھولے جائیں گے، وہ لوگ کبھی جنّت میں نہ جائیں گے یہاں تک کہ اونٹ سُوئی کے ناکے کے اندر سے گزر جائے۔

حکمت: (۱) خُدا تعالیٰ کی آیات سے أئمّۂ طاہرین صلوات اللہ

علیہم مُراد ہیں، لہٰذا ان حضرات کو جُھٹلانا آیات اللہ کو جُھٹلانا ہے، اُن برگزیدہ ہستیوں کے منصب کا دعویٰ کرنا بدترین تکبّر ہے۔

(۲) چونکہ آسمان سات ہیں، اِس لئے یہاں رُوحانیّت کے سات دروازوں کا ذکر ہے۔

(۳) اُونٹ کی تاویل یہاں آدمی کا اپنے آپ کو بڑا سمجھنا ہے، اونٹ کا سُوئی کے ناکے سے گزُر جانا یہ ہے کہ انسان حقیقی معنوں میں دین کی اطاعت کرے، اور عجز و انکساری سے اپنی مُنجمد رُوح کے اُونٹ کے ذرّات بنائے، اب یہ اُونٹ جو ناقۂ صالح ؑ کی طرح لطیف ذرّات کی حیثیت میں ہے، وہ سُوئی کے ناکے سے گزُر سکتا ہے۔

مذکورۂ بالا آیت سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ معراج، معارج، اور راہِ جنّت کا مطلب ایک ہی ہے، کیونکہ رُوح اور عقل کے جس اعلیٰ مقام پر خُداوند تعالیٰ کا انتہائی قرب حاصل ہوتا ہے، وہیں معراج بھی ہے اور بہشت بھی، یعنی اِنسان کا سفر عالمِ سِفلی کی پستی سے عالمِ عُلوی کی بلندی کی طرف ہے، جس کی مثال سیڑھی (معراج) سے دی گئی ہے، اور رُوحانیّت کی سیڑھی ہادیٔ برحق کی مبارک ہستی ہے۔

حضراتِ انبیاء و ائمّہ علیہم السّلام بحقیقت بنی آدم ؑ ہیں، کیونکہ یہی صاحبان اوصافِ آدم ؑ کے وارث و مالک ہیں، چنانچہ بموجب آیۂ کریمہ (۱۷۲ ؍ ۷) پروردگار کی سُنّت یہ ہے کہ وہ ہر پیغمبر اور ہر امام کی پشت سے اس کی دُنیا کی ذرّیّت کو دستِ قُدرت میں لیا کرے، جبکہ ایسے اِنسانِ کامل کی ذاتی

قیامت برپا ہو جاتی ہے، اور خدا نے ان ذرّیات (ذرّاتِ ارواح) کو اس معنی میں لیا کہ ان میں حرکت پیدا ہو گئی، اور متعلقہ شخصیت کے رُوحانی عرُوج وارتقاً کے تحت ان کو ایک طرح کی رفعت دی گئی، جیسا کہ ارشاد ہے۔

اور جب آپ کے ربّ نے اولادِ آدمؑ کی پُشتوں سے ان کی ذرّیت کو لیا اور ان کو اپنی جانوں پر حاضر کر کے گواہ بنایا کہ کیا میں تمہارا ربّ نہیں ہُوں؟ سب نے جواب دیا کیوں نہیں۔

حکمت: (۱) عہدِ الست کا واقعہ جس میں معجزۂ معراج ہے ہر کاملِ اِنسان کی رُوحانیّت میں پیش آتا ہے، جس میں تمام اہلِ زمانہ بصُورتِ ذرّات شامل ہوتے ہیں۔

(۲) اِسی طرح ربِّ کریم نے بنی آدمؑ (انبیاء وائمہؑ) کو روح کا مُشاہدہ کرایا اور اس کی کامل معرفت عطا کر دی۔

(۳) اُس بلندی پر لوگوں کے ذرّاتِ رُوح بھی موجود تھے، مگر غیر شعوُری حالت میں۔

دُنیا کی مثال میں راہ الگ ہوتی ہے اور رہنما اس پر ہوتے ہُوئے ایک الگ وجود ہوتا ہے، مگر اس کے برعکس دین میں ایک ہی شخص (جو ہادیٔ برحق ہے) راہ و رہنما دونوں کا کام انجام دیتا ہے، چُنانچہ اس کو قرآنِ حکیم نے کبھی تو صراطِ مُستقیم کے نام سے پُکارا، کبھی ہادی کہا، کبھی نُور، کبھی معراج وغیرہ، غرض جیسے جیسے اس کے بے شمار کام ہیں، ویسے ویسے اس کے بے حساب نام ہیں کیونکہ خُدا نے اس کو سب کچھ ہونے کا درجہ دیا ہے (۳۶/۱۲)

حضرت یعقوبؑ علیہ السّلام اپنے وقت میں امامِ مستودع، صراطِ مُستقیم، اور خُدا کی سیڑھی تھے، جس کے چودہ زینے تھے، یعنی امامؑ، باب، اور بارہ حُجّت، جن کی مثال قرآنِ پاک (۱۲:۴) میں سُورج، چاند، اور گیارہ ستاروں سے دی گئی ہے، حضرت یُوسفؑ نے جب یہ نُورانی خواب دیکھا کہ آپؑ کو گیارہ ستارے، سُورج اور چاند سجدہ کر رہے ہیں، تو اُس وقت آپؑ بھی اس سیڑھی کے زینہ زیریں پر ایک ستارہ یعنی حُجّتِ اوّل تھے پھر بحکمِ خُدا زینہ بزینہ اِس نردبان (سیڑھی) کی چوٹی پر پہنچ گئے، جبکہ ان کو گیارہ ستاروں اور شمس و قمر نے فعلاً سجدہ (یعنی اطاعت) کیا، اِس مثال سے دین کی یہ بنیادی حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ انبیاء و ائمہؑ علیہم السّلام اللہ تعالیٰ کی جیتی جاگتی سیڑھیاں ہُوا کرتے ہیں۔

خُداوند تعالیٰ کی سیڑھی کی دُوسری مثال یہ ہے:-

۱۔ مُستجیب

۲۔ ماذونِ اصغر

۳۔ ماذونِ اکبر

۴۔ داعیٔ مکفوف

۵۔ داعیٔ مطلق

۶۔ حُجّتِ جزیرہ

۷۔ حُجّتِ حضوری (مقرّب)

۸۔ امامؑ

۹- اساسؑ

۱۰- ناطقؑ

۱۱- نفسِ کُلّی

۱۲- عقلِ کُلّی

جیسا کہ ارشاد ہے:-

هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ (۳/۱۶۳)

یہ لوگ (یعنی حدودِ دین) قربِ خدا کے درجات ہیں، اور اللہ تعالیٰ خوب دیکھتا ہے ان کے اعمال کو۔

حکمت: (۱) اللہ تبارک و تعالیٰ کی نزدیکی کے درجات اور کہیں تہیں صرف صراطِ مستقیم پر واقع ہیں، بلکہ یہ خود راہِ راست اور خدا تعالیٰ کی سیڑھی ہیں۔

(۲) آپ اس بات کو خوب جانتے ہیں کہ هُمْ دَرَجٰتٌ (وہ درجات ہیں) اور لَهُمْ دَرَجٰتٌ (انکے لئے درجات ہیں ۸/۴) کے درمیان فرق ہے۔

۱۲	عقلِ کُلّ
۱۱	نفسِ کُلّ
۱۰	ناطقؑ
۹	اساسؑ
۸	امامؑ
۷	باب
۶	حُجّتِ جزیرہ
۵	داعئ مطلق
۴	داعئ مکفوف
۳	ماذونِ اکبر
۲	ماذونِ اصغر
۱	مُستجیب

قرآنِ پاک میں جس طرح درجہ اور

ISW Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science Knowledge for a united humanity

درجات کا ذکر فرمایا گیا ہے، وہ حدودِ دین کا ذکر ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:۔

رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ ۚ يُلْقِى الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ (۱۵/۴۰) خُدا درجوں کا بلند کرنے والا ہے وہ عرش کا مالک ہے۔ اور اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے رُوح ڈالتا ہے اپنے امر سے تاکہ (وہ صاحبِ وحی) مُلاقات کے دِن سے ڈرائے۔ یعنی خُدا حدُودِ دین کو اور ان کے وسیلے سے دُوسروں کو بلند کرتا ہے۔

حکمت: (۱) اللہ تعالیٰ جب کسی کو بلند کرنا چاہتا ہے تو مقرّرہ درجات کی سیڑھی سے بلند کر دیتا ہے، کیونکہ یہی صراطِ مُستقیم ہے، اور یہی وہ سیڑھی ہے جو صاحبِ عرش کی طرف رجُوع کرنے کے لئے بامِ عرش تک قائم کی گئی ہے۔

(۲) اسی سیڑھی پر پیغمبروں کو وحی کی زندہ روح آتی ہے، اور اس سے چڑھ کر آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم خاص معراج کا شرف حاصل ہُوا۔

(۳) کوئی شئی نہیں، جس کے خزائن خدا کے پاس نہ ہوں، اور ان خُدائی خزانوں سے جو جو چیزیں نازل ہوتی ہیں، وہ اسی سیڑھی سے اُترتی ہیں۔

(۴) جب پروردگار کے عظیم اور پُرحکمت ناموں میں سے ایک نام ذی المعارج (سیڑھیوں والا ہے)، تو پھر قرآن (جس میں ہر چیز کا بیان ہے (۸۹/۱۶) میں اس کا کوئی منظّم تصوّر ہو گا، کوئی تفصیل ہو گی، اور اس موضوع

سے متعلق کچھ آیات ہوں گی، جی ہاں، ایسا ہی ہے، جیسا کہ یہاں اِس کا کچھ ذکر ہُوا، اور ہو رہا ہے۔

حضرت مولانا امام سلطان محمّد شاہ صلوات اللہ علیہ نے آیۂ مبارکۂ اِسترجاع (۱۵۶/۲) کی طرف پُرزور توجّہ دلائی ہے، اِس سِلسِلے کی تین آیتوں کا ترجمہ یہ ہے:

اور ہم تمھیں کچھ خوف اور بھُوک سے اور مالوں، جانوں اور پھلوں کی کمی سے ضرُور آزمائیں گے، اور (اے رسُولؐ) ایسے صبر کرنے والوں کو کہ جب اُن پر کوئی مصیبت آپڑی تو وہ (بیساختہ) بول اُٹھے "ہم تو خُدا ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں" خُوش خبری دیدو کہ انھیں لوگوں پر اُن کے پروردگار کی طرف سے دُرود اور رحمت ہے، اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں (۱۵۵/۲-۱۵۷)

حکمت: (۱) اگر مومن عالی ہمّت ہے تو ہر امتحان روح کے حق میں سُود مند ہو جاتا ہے، اور آزمائش کے بغیر کوئی عرُوج و ارتقاء نہیں۔

(۲) خُدائے علیم و حکیم کی نظر میں انتہائی مُفید نتائج کے لئے جیسے بڑے اہم امتحانات ضروری تھے، وہ بس یہی ہیں۔

(۳) خوف دِل کی ایک ایسی کیفیّت کا نام ہے کہ اس میں نفس تمام دُنیاوی خیالات کو چھوڑ کر عاجز اور قابلِ رحم صُورت اختیار کر لیتا ہے ایسے میں آدمی کی مکمّل توجّہ خُدا کی طرف ہو جاتی ہے۔

(۴) بھُوک سے نفسِ حیوانی کی اِصلاح ہو جاتی ہے۔

(۵) مال و جان کے نقصان سے دِل پر شکستگی اور فنائیت کی کیفیّت

طاری ہو جاتی ہے۔

(۶) ثمرات کے نقصان سے رُوحانیّت کا نقصان مُراد ہے، غرض یہ تمام احوال بشرطِ دینی شعوُر ایسے ہیں کہ ان کی بدولت خُدا کی طرف ہنگامی اور دائمی رجُوع کرنے میں زبردست مدد ملتی ہے۔

(۷) اِستِرجاع کا مطلب ... "اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ راجِعُون" کہنا ہے، مگر اس میں یہ جاننا ضروری ہے کہ اِنسان کا اصل مقام حضورِ الٰہی ہے، وہ خُدا کی سیڑھی سے اُتر کر یہاں آیا ہے، پھر اسی سیڑھی سے چڑھ کر اللہ تعالیٰ کے بحرِ نوُر میں رجوُع کرنا ہے۔

جس طرح اِس مضمُون کے شروع میں یہ ذِکر ہُوا کہ انبیاء و ائمّہ صلوات اللہ علیہم خُدا تعالیٰ کی سیڑھیاں ہُوا کرتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہُوا کہ ہر پیغمبر اور ہر امام اپنے حدُود کے ساتھ ایک زندہ روحانی سیڑھی کا کام انجام دیتا ہے، اور وہی شخصِ کامل ہادی بھی ہے، اور ہدایت بھی، وہ جس طرح آسمان اور عرشِ اعلیٰ کی مثال میں معراج (سیڑھی) ہے، اسی طرح زمین اور خانۂ خُدا کی مثال میں صراطِ مُستقیم بھی ہے، نیز وہ طوفان کی مثال میں کشتیٔ نجات بھی ہے، کیونکہ وہ ایک ایسی ہمہ گیر حقیقت ہے کہ اس کی طرح طرح سے مثالیں دی گئی ہیں۔

نصیر حقیر

۲۔جنوری ۱۹۸۵ء

سُنّتِ الٰہی

لفظِ سُنّت مادّۂ س ن ن سے ہے، اور اس کے معنی ہیں طریقہ، دستور، عادت، اور قانون، اور سُنّۃ اللہ سے اللہ تعالیٰ کی عادت اور حکمت مُراد ہے، جیسے قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے: سُنَّۃَ اللّٰہِ الَّتی قد خلت مِن قبل ولن تجد لِسُنّۃِ اللّٰہِ تبدیلاً (۴۸/۲۳) (یہی) خُدا کی عادت ہے جو پہلے سے چلی آتی ہے اور تم خدا کی عادت کبھی بدلتی نہ دیکھو گے۔ نیز ارشاد ہے: ولن تجد لِسُنّتِ اللّٰہ تحویلاً (۳۵/۴۳) اور خُدا کے طریقے میں کبھی تغیّر نہ دیکھو گے۔ یعنی اگرچہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے قبل کی شریعتیں فروعی اعتبار سے مختلف صُورتوں میں چلی آئی تھیں، لیکن ان سب کا مقصد ایک ہی ہے، اور وہ ہے خُداشناسی، اِطاعت اور ابدی نجات، جو رُوحِ اسلام کے مطابق عمل کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے۔

سُنّت کی جمع سُنَن ہے، اور یہ لفظ قرآنِ مُقدّس میں اس طرح آیا ہے: قد خلت مِن قبلکم سُنَنٌ فسیروا

فی الارض فانظروا کیف کان عاقبۃ المکذّبین (۳/۱۳۷)
تحقیق تم سے قبل مختلف طریقے گزُر چُکے ہیں تو تُم زمین میں سیر کرو اور دیکھو کہ تکذیب کرنے والوں کا انجام کیسا ہُوا۔ لفظ "سنن" میں یہاں تمام طریقوں کا ذکر ہے، خواہ مومنوں کا ہو یا کافروں کا، اور زمین میں سیر کرنا دو طرح سے ہے یعنی سیّارۂ زمین پر سیاحت کرنا اور زمینِ رُوحانیّت میں سیاحت کرنا، مگر یہاں جس زمین میں چلنے پھرنے کے لئے فرمایا گیا ہے، وہ زمینِ باطن ہے، جو عالمِ شخصی کی زمین ہے، اور کافروں کے انجام کو دیکھنے کا جو مقصد ہے، وہ صرف کسی ایسی اُجڑی ہُوئی بستی پر نظر ڈالنے سے پُورا نہیں ہو سکتا، جو کسی قوم کی نافرمانی کے نتیجے میں تباہ و برباد کی گئی ہو، کیونکہ جُھٹلانے والوں کی عاقبت صرف ظاہری ہلاکت تک محدُود نہیں، بلکہ عاقبت کا اصل مطلب رُوحانیّت اور آخرت ہے، پھر اس معنوی تحقیق سے یہ پتہ چلا کہ انبیاء و اولیاء کی تکذیب کرنے والوں کے انجام (عاقبت) کا مُشاہدہ مقامِ رُوحانیّت پر ہو سکتا ہے۔

سُنن کا دُوسرا استعمال اِس آیۂ کریمہ میں ہُوا ہے: یُرِیدُ اللّٰہُ لِیُبَیِّنَ لَکُم وَیَہدِیَکُم سُنَنَ الَّذِینَ مِن قَبلِکُم

قرآنِ حکیم میں لفظِ سُنّت: ۱۷/۷۷، ۳۳/۳۸، ۳۳/۶۲، ۳۵/۴۳، ۴۰/۸۵، ۴۸/۲۳، ۳/۱۳۷، ۴/۲۶ اِن آیاتِ کریمہ میں آپ ضرور غور کریں، اور ان کے ماقبل اور مابعد کو بھی دیکھیں۔

ویتوب علیکم (۴/۲۵) اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہے کہ تمہارے لئے بیان کرے اور تمہیں اُن لوگوں کے طریقوں پر چلائے جو تُم سے پہلے گزرے ہیں اور تُم پر توجّہ فرمائے۔ بیان کرنے سے تاویل مُراد ہے اور یہاں اگلے لوگوں سے انبیاء، صدّیقین، شہُداء اور صالحین مُراد ہیں (۴/۶۹) جس طرح سورۂ فاتحہ میں تعلیمِ سماوی دی گئی ہے کہ: اھدنا الصّراط المُستقیم صراط الّذین انعمتَ عَلیہِم (۱/۵-۶) چلائیے ہم کو راہِ راست پر اُن لوگوں کی راہ پر جن پر تُونے اِنعام فرمایا ہے۔ اِس ارشاد سے ایک طرف تو یہ معلوم ہُوا کہ قبل از اسلام کی شریعتیں اگرچہ ظاہر میں الگ الگ اور مختلف تھیں، لیکن ان کا باطن ایک ہی ہے، اور دُوسری طرف یہ پتہ چلا کہ جس معنیٰ میں خُدا کی سُنّت میں تبدیلی و تغیّر نہیں ہے، اس کا تعلّق دین کے بُنیادی اور باطنی اموُر سے ہے۔

مذکورۂ بالا آیات کی روشنی میں اِس حقیقت کا یقین محکم ہو جاتا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے دستور (سُنّت) کے مطابق ظہورِ اسلام سے پہلے اور زمانۂ نبوّت میں نورِ ہدایت کو جاری رکھا تھا، اِسی طرح وہی سلسلہ اب بھی جاری ہے، کیونکہ یہ امر دین کے اساسی اموُر میں سب سے اہم ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ (۲/۱۵۰) میں اپنی نعمت کی تکمیل کا مُسلمانوں سے وعدہ فرمایا، اور اسی مقام پر (۲/۱۵۱) اس عظیم نعمت کی نوعیّت اور فوائد کا ذِکر فرما دیا، اور پھر غدیرِ خُم میں یہ حُکم نازل ہُوا:-

الیومَ اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی

ورضیتُ لکم الاسلامَ دنیا (۵/۳) آج میں نے تمہارے دین کو کامل کردیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کردی اور (اس) دینِ اسلام کو پسند کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ وہ دن تھا، جس میں حضورِ اکرمؐ نے خُدائے پاک و برتر کے منشا و سُنت کے مطابق مولا علیؑ کو اپنا خلیفہ و جانشین اور امام بنا دیا، کیونکہ امام جب پہلے سے ہوتا چلا آیا ہے تو ختمِ نبوّت کے بعد اس کا ہونا اور بھی زیادہ ضروری ہے، جیسا کہ فرمانِ خُداوندی ہے:۔

سُنّۃَ مَن قد ارسلنا قبلک مِن رُّسِلنا ولا تجدُ لسُنّتِنا تحویلاً (۱۷/۷۷) یہ ہمارا مُستقل طریقِ کار ہے جو اُن سب رسُولوں کے مُعاملے میں ہم نے برتا ہے جنھیں تم سے پہلے ہم نے بھیجا تھا، اور ہمارے طریقِ کار میں تُم کوئی تغیّر نہ پاؤ گے۔ یعنی جس طرح دَورِ نبوّت میں ہدایت کا سلسلہ جاری و باقی رہا ہے اسی طرح یہ دَورِ امامت میں بھی چلتا رہے گا، اور خُداوند تعالیٰ کی اِس عادت میں کہ وہ ہمیشہ رُوئے زمین پر اپنا خلیفہ مقرّر فرماتا ہے کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

آپ دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عادت ماضی، حال، اور مُستقبل پر محیط ہے، اور اس میں کوئی تبدّل و تغیّر نہیں، چنانچہ ربِّ کریم نے اپنی عادت کے مطابق نورِ ہدایت اور کتابِ مُبین کو نازل فرمایا (۵/۱۵) کتابِ سماوی (قرآن) کے وجُود کے بارے میں کسی مُسلمان کو کیا شک ہو سکتا تھا، لہٰذا نور کے باب میں ارشاد ہُوا کہ: نورِ خداوندی کو کوئی نہیں بُجھا سکتا، وہ تو درخشان و تابان قائم و دائم رہے گا (مفہوم ۹/۳۲، ۶۱/۸)

کیونکہ نورؔ کا آخری مقصد مومنین کی منازلِ رُوحانیّت اور مراحلِ قیامت میں رہنمائی کرنا ہے (۱۲/۵۷)۔

سورۂ مومن کے آخر (۴۰/۸۵) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِیْ قَدْ خَلَتْ فِیْ عِبَادِهٖ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ (۴۰/۸۵) اللہ تعالیٰ کی عادت یہی ہے جو ہمیشہ اس کے بندوں میں جاری رہی ہے اور کافر لوگ اِسی جگہ خسارے میں پڑ گئے۔ "فی عبادہٖ" کے انتہائی معنی ہیں اس کے خاص بندوں کے باطن یعنی رُوحانیت میں، بالفاظِ دیگر انبیاء و أئمّہ صلوات اللہ علیہم کی ذاتِ بابرکات میں، کیونکہ کسی انسان کی عادت ہر چند کہ ایک جیسی نہیں رہ سکتی ہے، لیکن وہ بہرحال اس کی خصوصیات کے تحت بنتی ہے، مگر خدا کی عادت ہمیشہ ایک جیسی ہے اور وہ اللہ کے جُملہ اسمائے صفات اور قول و فعل کے تحت ہے، جس کا ظہور سب سے پہلے مظہرِ خُدا کے آئینۂ دِل (رُوحانیّت) میں ہوتا ہے، پس جو لوگ اِس سِرِّ عظیم کو جانتے ہیں، وہ بڑے فائدے میں ہیں، اور جو اِس بھید کو نہیں سمجھتے ہیں، وہ بڑے خسارے میں ہیں۔

یہ اصول خدائے حکیم کی عادت میں سے ہے کہ وہ ہمیشہ کارِ ہدایت کے لئے خاندانِ نبوّت کو برگزیدہ فرماتا ہے، جیسے اُس نے حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ، آلِ ابراہیمؑ، اور آلِ عمرانؑ کو سارے جہان والوں پر برگزیدہ کیا (۳/۳۳)، جیسے ربّ العزّت نے آلِ ابراہیمؑ کو کتاب، حکمت اور ملکِ عظیم عطا کر دیا[1]، اور جس طرح حضرت ابراہیم

---

[1]: (۴/۵۴)

علیہ السلام نے اسی قانون کے مطابق اللہ کی اس خصوصی رحمت کے لئے دُعا کی تھی کہ امامت تاقیامت آپؑ ہی کی نسل میں جاری رہے (۱۲/۲۴)

سورۂ رعد (۱۳/۳۸) میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ایک حکمت آگین فرمان اس طرح ہے جس سے سُنّتِ الٰہی کی ترجمانی ہوتی ہے: ولقد ارسلنا رُسُلاً مِن قبلک وجعلنا لہم ازواجاً وذُرّیّۃً (۱۳/۳۸) اور یقیناً ہم نے آپ سے پہلے بہت سے رسُول بھیجے اور ہم نے انکو بیبیاں اور بچّے بھی دیئے۔ لفظِ ذُرّیّت کے معنی ہیں اولاد، نسل، خواہ بیٹا ہو یا بیٹی، کیونکہ یہ لفظ قرآنِ حکیم میں بچّہ اور بچّی دونوں کے لئے آیا ہے، جیساکہ قولِ قرآن ہے: واذ اخذ ربّک مِن بنی آدم من ظهورهم ذُرّیّتهم واشهدهم علیٰ انفسهم الستُ بربّکم قالوا بلیٰ شهدنا (۷/۱۷۲) اور جب آپ کے ربّ نے اولادِ آدمؑ کی پُشت سے ان کی ذُرّیّت کو لے لیا اور ان سے انھیں کے متعلّق اقرار لیا کہ کیا میں تمھارا ربّ نہیں ہوں سب نے جواب دیا کیوں نہیں ہم گواہ بنتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہاں ذُرّیّت کا لفظ مرد عورت سب کے لئے استعمال ہُوا ہے، چنانچہ خُدا تعالیٰ کا آنحضرتؐ سے یہ فرمانا کہ ہم نے آپ سے قبل کے تمام پیغمبروں کو بیبیاں اور ذُرّیّت دی تھی، یہ معنی رکھتا ہے کہ حضورِ انورؐ کا بھی خاندان اور ذُرّیّت ہے، اور آپؐ کی وہ پاک وپاکیزہ ذُرّیّت حضرت فاطمۃ الزّہرا صلوات اللہ علیہا ہیں، اور اسی عظیم تصوّر کے پیشِ نظر قرآنِ پاک میں

لفظ ذُرّیّت کو انتہائی حکیمانہ انداز میں اِستعمال کیا گیا ہے، جیسے آیۂ اصطفا کے حصّہ ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِن بَعْضٍ (۳۴/۳) میں کامل مردوں اور پاک عورتوں کی اولاد کا ذِکر فرمایا گیا ہے، کیونکہ جہاں کہیں کسی ذُرّیّت کی اِصالت ونجابت کی تعریف و توصیف ہو تو وہ حقیقت میں ماں باپ کی وجہ سے ہے۔

قرآنِ مجید میں حضرت عیسےٰ علیہ السّلام کو ۲۲ دفعہ "اِبْنِ مریم" کے نام سے یاد فرمایا گیا ہے، قرآنِ حکیم جیسی آسمانی کتاب میں اس قسم کے نام کا بار بار آنا حکمت سے خالی نہیں، چُنانچہ اس میں پانچ حکمتیں پوشیدہ ہیں:

۱۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ جس طرح پیغمبر اور امام کے پدری رشتے کی اہمیّت ہے اِسی طرح مادری رشتے کی بھی اہمیّت ہے۔

۲۔ اِنسانِ کامل کو خاندانی فضائل باپ سے بھی آتے ہیں اور ماں سے بھی۔

۳۔ اس میں یہ مثال ہے کہ ہر کامل یا ہر مریم جیسی رُوحانی ماں حضرت عیسےٰؑ جیسے روحانی فرزند کو جنم دے سکتی ہے۔

۴۔ اس میں ائمّۂ طاہرین کے فاطمۂ زہراؑ کے توسّط سے آلِ محمدؐ ہونے کا زندہ ثبوت ہے۔

۵۔ یہ خواتین کی عظمت و بزرگی کی ایک روشن دلیل ہے۔

اللہ تعالیٰ کی عادت ہر پیغمبر اور ولیٔ امر کی ذاتِ اقدس میں گزرتی آئی ہے، اور اسی مرکز سے لوگوں پر اثر انداز ہوتی رہی ہے، آپ اِس

حقیقت کی تحقیق و تصدیق قرآنِ حکیم کے دو موضوع سے کر سکتے ہیں، وہ ہیں "سُنّتہ اللہ" اور "قصّۂ انبیاء" کیونکہ جس طرح ایک آیت کی تفسیر دوسری آیت سے ہوا کرتی ہے، اسی طرح ایک موضوع کی وضاحت دوسرے موضوع سے ہوتی ہے، چنانچہ خدا کی عادت کی تفسیر و تاویل قصّۂ انبیاء ہے، یہ تو معنی پھیلانے کی بات ہوئی، اور اگر معنی کو مرکوز کیا جائے تو پھر کہنا پڑے گا کہ انبیا و اولیاء علیھم السّلام خود سُنّتِ خدائی ہیں، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی سُنّتِ مُجُسّم ہیں۔

نوٹ: سُنّتِ الٰہی کے متعلق مزید معلومات کے لئے

ملاحظہ ہو: "عِلم کے موتی" صفحہ نمبر ۳۵

نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی

۶- فروری ۱۹۸۴ء

تطہیر و تزکیہ

(۱)

تطہیر و تزکیہ کے معنی ہیں بحکم خدا و رسولؐ کا اہلِ ایمان کو ظاہراً وباطناً پاک وصاف کر دینا، جیسا کہ سورۂ توبہ (۹/۱۰۳) میں ارشاد فرمایا گیا ہے :-

خُذ من اموالھم صدقۃً تُطھّرھم وتزکّیھم بھا وَصَلِّ علیھم۔ انّ صلوٰتک سکنٌ لّھم (۹/۱۰۳)، اے رسولؐ، تم اُن کے مالوں میں سے صدقہ (یعنی زکات) لے لو کہ اس کے ذریعے سے تم انکو ظاہر و باطن میں پاک و پاکیزہ کرو گے اور ان کو صلوٰۃ دو کیونکہ تمہاری صلوٰۃ ان کے لیئے تسکینِ قلب ہے۔ اِس آیۂ کریمہ میں سات اساسی یعنی بُنیادی حکمتیں ذیل کی طرح ہیں :-

۱۔ خُذ (تو پکڑ، تو لے) اَخذ کے مصدر سے امر ہے، اِس فعل کا تعلّق ہاتھ سے ہے، اور یہ خدا تعالیٰ کا حکم ہے، جو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے فرمایا گیا ہے، تاکہ آنحضرتؐ مومنین سے ظاہری (مادی) اور باطنی (علمی) زکات لیا کریں، کیونکہ صدقہ اور زکات خدا کا حق ہے، اور آپؐ

کا پاک ہاتھ یَدُ اللّٰہ (۴۸/۱۰) کا درجہ رکھتا ہے، اور آنحضورؐ کے برحق جانشینوں (یعنی ائمۂ طاہرینؑ) میں یہ مرتبہ باقی وجاری ہے، تاکہ اس دستِ خدا سے ظاہر وباطن میں جو جو رحمتیں اور برکتیں حاصل ہوتی رہتی ہیں، ان میں کوئی کمی واقع نہ ہو، جیسے اخذِ زکات کے علاوہ عمل بیعت (۴۸/۱۰) ہے جو انتہائی ضروری ہے، کیونکہ بیعت کے معنی ہیں خرید وفروخت، یعنی یہ عملی تشبیہہ وتمثیل اور اقرار ہے اس بات کا کہ خداوندِ عالم نے اپنے نمائندۂ حاضر اور موجود کے توسّط سے مومنین کی جانوں کو اور انکے مالوں کو خرید لیا ہے اور اس کے عوض میں ان کو بہشت ملے گی (۹/۱۱۱) غرض یہ کہ ذاتِ سُبحان ہر قسم کے اعضاء سے پاک وبرتر ہے، لیکن اُس نے جس نورِ مجسّم کو اپنا ہاتھ قرار دیا ہے، اس کو یہ زبردست قدرت بھی عطا کر دی ہے، کہ جس سے وہ ظاہر وباطن کا ہر ہر کام کر سکتا ہے۔

۲۔ مال مادّی اور روحانی دو قسم کا ہوتا ہے، ظاہری اور جسمانی مال کو سب جانتے ہیں، باطنی اور روحانی مال سے حقیقی علم مراد ہے، چنانچہ زکات وصدقہ دونوں قسم کے مالوں سے لیا جاتا ہے، کیونکہ وہ دونوں چیزیں رزق اور دولت ہیں، اور دونوں کی پاکیزگی اور صفائی ضروری ہے، تاکہ وہ پاک ہوں، اور ان میں گوناگوں برکتیں پیدا ہو جائیں۔

۳۔ صدقہ ظاہر میں مادی زکات ہے، اور باطن میں صدقہ سے علمِ تاویل مُراد ہے، کیونکہ صدقہ کا لفظ صدق سے نکلا ہے اور صدق کے معنی ہیں سچ بولنا، اور صاحبِ تاویل کو سچّا ماننا، کہ وہ اپنی تاویل سے رسول اللہ کے روحانی معجزات

کی تصدیق کرتا ہے، جیسے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے مولا علی علیہ السّلام سے فرمایا: انت الصّدّیق الاکبر۔ یعنی تُم سچ بولنے والا اور تاویل کی روشنی میں میری تصدیق کرنے والا ہو۔ پس باطنی صدقہ یا زکات (یعنی تاویل) کے مختلف درجات ہیں۔

۴۔ تطہیر یعنی تطہیرھم کا تعلّق ظاہری مال، جسم اور جان سے ہے، کہ زکاتِ ظاہر کے دینے سے نہ صرف مادّی مال پاک ہو جاتا ہے بلکہ اِس سے جسم و جان کی بھی پاکیزگی ہو جاتی ہے، وہ اس طرح کہ حُکمِ زکات پر عمل کرنے سے مال حلال ہو جاتا ہے، حلال مال کھانے سے جسم پاک ہو جاتا ہے، اور جسم کے پاک ہونے سے جان پاک ہو جاتی ہے۔

۵۔ تزکیہ یعنی تزکیھم کا اشارہ مومنین کی عقلی پاکیزگی کی طرف ہے، کیونکہ قرآنِ کریم کی کئی آیاتِ مبارکہ میں یہ ارشاد موجود ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم ایمانداروں کو کتاب وحکمت (یعنی تنزیل وتاویل) سکھا کر پاک کیا کرتے تھے (۲/۱۲۹، ۲/۱۵۰-۱۵۱، ۳/۱۶۴، ۶۲/۲) چُنانچہ ظاہر ہے کہ علم وحکمت کے زیرِ اثر جو چیز پاک وصاف ہو جاتی ہے، وہ صرف مومن کی عقل ہی ہے، اور قرآنِ حکیم میں جہاں جہاں جسم وجان کی پاکیزگی کا ذکر آیا ہے، اِس کا مقصد بھی یہی ہے کہ اِنسان کو عقلی پاکیزگی کی طرف لایا جائے، کیونکہ منزلِ آخرین اسی عقل میں ہے، لہٰذا یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا سب سے بڑا احسان ہے کہ اُس مہربان نے ہر زمانے میں لوگوں کے درمیان وسیلۂ تطہیر وتزکیہ کو موجود وحاضر رکھا ہے، تاکہ وہ اہلِ ایمان کے مال، جسم، جان اور

عقل کو پاک و پاکیزہ کرے، جیسے قرآنِ مجید (۲/۱۵۰-۱۵۱) میں نورِ نبوّت کے بعد نورِ امامت کے تقرر کا ذکر فرمایا گیا ہے:۔

اور تاکہ تم پر جو میرا انعام ہے اس کی تکمیل کر دوں اور تاکہ تم راہِ حق پر چلو (مسلمانو! یہ احسان بھی ویسا ہی ہے) جیسے ہم نے تم میں تم ہی میں کا ایک رسول بھیجا جو تم کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائے اور تم کو پاک کرے اور تمھیں کتاب (قرآن) اور حکمت کی باتیں سکھائے اور تم کو وہ باتیں سکھائے جن کی تم کو خبر بھی نہ تھی (۲/۱۵۰-۱۵۱) یہ تو ایک قرآنی حقیقت ہے کہ آنحضرتؐ کے بعد کوئی پیغمبر نہیں (۳۳/۴۰) اس کے معنی یہ ہوئے کہ کوئی جدید وحی نازل نہیں ہوگی (یعنی قرآنِ مقدّس اور دینِ اسلام ہی قائم رہے گا) باقی جتنی چیزیں علم و حکمت اور رُشد و ہدایت کے عنوان سے ہیں، ان کا جانشینِ رسولؐ یعنی امامِ برحقؑ میں ہونا ضروری اور لازمی ہے، یہاں تک کہ خدائے علیم و حکیم ہر امام کے سامنے سے زمان و مکان کے تمام ظاہری اور باطنی حجابات کو اُٹھاتا ہے، تاکہ نورِ امامت نورِ نبوّت کو نزولِ وحی کے مقامات پر دیکھے اور جملہ احوال سے باخبر ہو کر آنحضرتؐ کی نبوّت و رسالت پر شاہد (گواہ) ہو، اس حد تک رسائی، حاضری، اور مکمّل آگہی کے بغیر کوئی شخص کارِ نبوّت کا حقیقی شاہد نہیں بن سکتا ہے۔

۶۔ صَلِّ کے لفظ میں رسولِ اکرمؐ سے فرمایا گیا ہے کہ آپؐ مومنین کو صلوٰۃ دیں، لیکن یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ صلوٰۃ کس معنیٰ میں ہے؟ کیونکہ صلوٰۃ کے کئی معنی ہیں، چنانچہ قرآنِ کریم کی روشنی میں یہ حقیقت

روشن ہو جاتی ہے کہ یہ لفظ (یعنی صلوٰۃ) دُرُود کے معنی میں ہے، کیونکہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲:۱۵۷ سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ دُرُود، رحمت، اور ہدایت تمام اہلِ ایمان کے لئے مشترک ہے، جس طرح سورۂ احزاب (۳۳:۴۳) میں ارشاد فرمایا گیا ہے: خدا ایسا ہے کہ وہ اور اس کے فرشتے تم پر دُرُود بھیجتے ہیں، تاکہ خُدا تعالیٰ تم کو تاریکیوں سے نکال کر نُور کی طرف لے آئے اور اللہ تعالےٰ مومنین پر بہت مہربان ہے (۳۳:۴۳) اب اِس مقام پر ہر دانشمند کو یہ سوچنا ہوگا کہ آیا یہ ممکن ہے کہ ربّ العزّت اور اس کے ملائکہ کا یہ دُرُود رحمتِ عالم ؐ کے بغیر دینداروں پر نازل ہو جائے؟ حالانکہ ادھر خداوند عالم کا حکم ہو رہا ہے کہ: وَصَلِّ علیھم (اور تم ان کو صلوٰۃ دو)؟ اس سے ظاہر ہے کہ یہ صلوٰۃ (دُرُود) جو خدائے پاک اور اس کے عظیم فرشتوں کی جانب سے ہے، جس کا مقصد نورِ علم ہے، حضورِ انورؐ کے توسّط سے مومنین کو پہنچتی ہے، کیونکہ آپؐ ہی کی ذاتِ عالی صفات ہر ہر عالمِ شخصی کے لئے رحمت ہے (۲۱:۱۰۷)

قانُونِ حکمت کہتا ہے کہ جب مومنین مُحمّدؐ و آلِ مُحمّدؐ پر دُرُود پڑھتے ہیں، تو یہ ایک پاک کلمے کی حیثیت سے بلند ہو کر خُداوندِ عالم کے حضور میں پہنچ جاتا ہے (۳۵:۱۰) پھر اللہ اس کو ایک نورانی ہیئت دے کر پیغمبرِ برحقؐ اور امامِ زمانؑ کے توسّط سے مومنین کی طرف بھیجتا ہے، کیونکہ ہر چیز ایک دائرے پر واقع ہے، لٰہذا وہ جہاں سے روانہ ہو جاتی ہے، آخر کار کسی نہ کسی صُورت میں وہاں گھوم کر واپس آتی ہے، مگر

یہ ہے کہ بعض چیزیں بڑی سرعت سے اور بعض زمانہائے دراز کے بعد لوٹ جاتی ہیں (۲۱/۳۴، ۴۶/۴۰)

جب پروردگارِ عالم تابعدار مومنین کے جُملہ اقوال و اعمال کو نورِ نورانیت کے رنگ سے رنگین بنا دیتا ہے (۲/۱۳۸) تو پھر سرورِ انبیاء صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کی اُس صلوٰۃ کی کیا شان ہوگی، جو آپؐ بحکمِ خُدا ایمانداروں کو دیتے ہیں؟ جس میں خدا اور فرشتوں کی صلوٰۃ بھی شامل ہے؟ یقیناً وہ نور کی شعاعیں برسنے کی صورت میں ہے، چنانچہ وَصَلِّ علیھم (اور ان پر دُرُود بھیجو) کی تاویل یہ ہے کہ اے رسولؐ اُن پر نورِ علم و حکمت کی شعاعیں برسا، کیونکہ اِس آسمانی دُرُود کا مقصد یہی ہے کہ خدا تعالیٰ اہلِ ایمان کو جہالت کی تاریکی میں رکھنا نہیں چاہتا ہے، انکے باطن کو نورِ یقین سے منوّر کر دینا چاہتا ہے، جیسا کہ اِس کے پاک فرمان کا ذکر ہُوا (۳۳/۴۳)

۷۔ تسکین زیرِ بحث آیۂ کریمہ کی آخری حکمت ہے، لہٰذا وہ عظیم شئی ہے اور وہ نور ہے، یعنی کرنیں برسنے کے نتیجے میں نُور کا سامنے آنا، جس سے کئی معنوں میں حقیقی مومنین کو تسکین و تسلّی حاصل ہوگی، مثال کے طور پر:

الف: اِس بات کا یقین ہوگا کہ خُدا و رسُولؐ برحق ہیں، قرآن، اِسلام، اور امامِ زمانؑ برحق ہیں، کیونکہ ان کے یہاں روشنی پر روشنی ہے۔

ب: روشنی کو دیکھ کر یُوں یقین آئے گا کہ الحمدُ لِلّٰہ مال، جسم، اور جان کی تطہیر کا مُعاملہ درست چل رہا ہے، اور تزکیۂ عقل کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں۔

ج : ذکر و عبادت اور ہر نیک عمل خدا کے حضور میں قبول ہوتا ہے۔

د : یقیناً یہی قرآنِ حکیم اور نورِ امامت کی پُرحکمت ہدایت و رہنمائی ہے، اور یہی صراطِ مستقیم پر مومن کی ترقّی و پیشرفت ہے۔

ھ : اس حال میں وسوسۂ شیطانی اور خیالِ باطل کی پریشانی نہ ہوگی۔

و : ایسے میں ابدی نجات کی اُمید کا وابستہ ہو جانا لازمی امر ہے۔

قرآنِ حکیم میں بظاہر طہارت کے معنی عام بھی ہیں اور خاص بھی، کیونکہ یہ لفظ ظاہری اور باطنی دونوں قسم کی چیزوں کے لئے استعمال ہُوا ہے، مگر زکات کے معنی عام نہیں خاص ہیں، کیونکہ یہ باطنی چیزوں کے لئے مستعمل ہے، طہارت و تطہیر کے مختلف الفاظ قرآنِ پاک میں کُل ۳۱ مقامات پر ہیں، جبکہ زکات و تزکیہ سے متعلق تمام صیغے ۵۹ جگہوں میں مذکور ہیں۔

کامل اِنسانوں کی تطہیر کی ایک خاص مثال اِس آیۂ کریمہ میں موجود ہے: اِذ قال اللہ ...... اِلیٰ یوم القیامۃ (۳/۵۵) جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے عیسیٰؑ بیشک میں تم کو وفات دینے والا ہوں اور تم کو اپنی طرف اُٹھانے والا ہوں اور جنھوں نے تمھارا اِنکار کیا ہے ان سے تم کو پاک کرنے والا ہوں اور تمھاری پیروی کرنے والوں کو قیامت تک اُن پر بالا دست رکھوں گا جنھوں نے تمھارا انکار کیا ہے۔ اِس ربّانی تعلیم میں کئی تاویلی اِشارے موجود ہیں، چنانچہ یہاں حضرتِ عیسیٰ علیہ السّلام

کی جس وفات کا ذکر فرمایا گیا ہے، وہ آپؑ کی رُوحانی موت تھی، جو تمام کامل انسانوں پر جسمانی زندگی ہی میں واقع ہو جاتی ہے، اور اسی کے ساتھ ذاتی قیامت برپا ہو جاتی ہے، جس کا بارہا ذکر ہو چکا ہے، اُس دوران شخصِ کامل کی صُورتِ روح بلکہ صُوَرِ روح کو اللہ تعالیٰ کی طرف اُٹھالیا جاتا ہے، رفعِ رُوح کا یہ معجزۂ مُتواتر جو حضرت عزرائیل علیہ السّلام دکھاتا ہے بڑا حیرت انگیز ہے، اسی کے ساتھ ساتھ انسانِ کامل کی تطہیر بھی ہو جاتی ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے عالمِ شخصی میں منکرین کے جتنے ذرّاتِ رُوح ہیں وہ ایک طرح سے ہلاک ہو جاتے ہیں۔

سورۂ بقرہ (۲) آیت ۱۷۴ اور سورۂ آلِ عمران (۳) آیت ۷۷ کا تاویلی مفہوم یہ ہے کہ قیامت کے دن بعض لوگ اپنی نافرمانیوں کی وجہ سے کلامِ خُداوندی کی سماعت اور وجہ اللہ کی رُویت سے محروم ہو جائیں گے، جس کی وجہ سے ان کی کوئی پاکیزگی نہ ہوگی، اس کے برعکس کچھ دُوسرے لوگوں کو کلامِ پاک اور دیدارِ اقدس کی سعادت حاصل ہوگی جن کی بدولت وہ بدرجۂ کمال پاک و پاکیزہ ہوں گے، اس کا مطلب یہ ہُوا کہ نہ صرف کلمۂ باری علم و حکمت کا سب سے بلند ترین سرچشمہ ہے، بلکہ رُویت میں بھی سب سے بڑا اشاراتی خزانہ پوشیدہ ہے، پس عقل کا انتہائی تزکیہ اسی مقام پر ہو جاتا ہے۔

اس مادّی دُنیا میں ظاہری صفائی اور پاکیزگی کے کئی ذرائع ہیں، اور پانی اس مقصد کے لئے خاص ہے، کہ اس میں چیزیں دھولیا کرتے

ہیں، اور پانی خُود بھی فطری طور پر بہت سی چیزوں کو دھولیتا ہے، بالفاظِ دیگر اس میں کئی صاف و ناصاف اشیاء حل ہو جاتی ہیں، مگر آخرکار آپ دیکھتے ہیں کہ سمندر اپنے وجود کی صفائی و پاکیزگی کے لئے نور (سورج) سے رجوع کرتا ہے، اور نور یعنی آفتابِ جہاں تاب ہی ہے، کہ وہ نہ صرف آفاقی دُولاب (رہٹ) کو چلاتا ہے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ پانی کو لطافت، جدّت، اور پاکیزگی بھی بخشتا ہے، پس یہ نُورِ علم و حکمت کی ایک روشن مثال ہے کہ وہی عقلی و علمی پاکیزگی کا سب سے آخری اور سب سے اعلیٰ وسیلہ ہے۔

نصیر الدّین نصیر ہونزائی

۱۳۔ فروری ۱۹۸۵ء

تطہیر و تزکیہ
(۲)

آپ جانتے ہیں کہ "تطہیر و تزکیہ" کے موضوع کی ان دونوں قسطوں میں طہارت و زکات کے باطنی پہلو پر روشنی ڈالنا مقصود ہے، اس موضوع کی بہت بڑی اہمیت اس لئے ہے کہ طہارت و زکات اسلام کے سات ارکان میں سے ہیں، چنانچہ قانونِ قرآن کے مطابق روحی اور عقلی صفائی و پاکیزگی اتنی ضروری اور لازمی ہے کہ اس کے بغیر کوئی کامیابی نہیں، جیسا کہ خداوندِ عالم کا فرمان ہے:۔

قد افلح من زکّٰھا۔ وقد خاب من دسّٰھا (۹۱/۹-۱۰)

یقیناً وہ مُراد کو پہنچا جس نے اُس (جان) کو پاک کر لیا اور نامراد ہوا جس نے اس کو (نافرمانی میں) گاڑ دیا۔ یہ سورۂ شمس (۹۱) کا ارشاد ہے، جس کا خاص موضوع نفس یعنی رُوح ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اِس حکمت آگین سورے کی سات ابتدائی آیات میں الگ الگ گیارہ عالی مرتبت چیزوں کی قسم کھائی ہے، اور اسی حکیمانہ طریق پر اصل موضوع کی طرف مکمّل توجّہ دلانے کے بعد یہ ذکر فرمایا گیا ہے کہ روح کو کیا کیا صلاحیتیں دی گئی ہیں،

پھر بڑی شدّت کے ساتھ انسان کو احساس دلایا گیا ہے کہ وہ خود اپنی روح کی پاکیزگی کا ذمہ دار ہے، اور یہ ذمہ داری اس معنی میں ہے کہ وہ وسیلۂ تطہیر وتزکیہ سے رجُوع کرے۔

مذکورہ سورۂ مبارکہ میں پروردگارِ پاک نے سُورج، چاند، وغیرہ کی تاویلی حکمت میں جن بلند درجات کی قسم کھائی ہے، ان میں سے ایک درجہ روح بھی ہے، جس سے حقیقی روح کی عظمت وبُزرگی کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے، کیونکہ ربِّ کریم بحقیقت عام چیزوں کی قسم نہیں کھاتا، پس یہ خُدائے علیم وحکیم کی جانب سے لوگوں کے لئے پُرزور اِشارہ ہے، تاکہ وہ اپنی روح کی قدرومنزلت کو سمجھتے ہُوئے اس کو پاک وپاکیزہ کرلیں۔

اگر رات کے وقت آسمان پر بادل چھائے ہُوئے نہیں ہیں، تو ایک دوسرے سے الگ الگ اور دُور واقع ہونے کے باوجود تمام ستاروں کی روشنی ایک ہوکر زمین کی طرف آتی ہے، اسی طرح ہر قرآنی موضوع سے متعلّق آیات اگرچہ یکجا نہیں، بلکہ قرآنِ حکیم میں پھیلی ہوئی ہیں، لیکن اہلِ بصیرت کے نزدیک متعلقہ آیتوں کی حکمتیں مرکوز ہوجاتی ہیں، کیونکہ قرآنِ پاک دراصل سماوی نظام کے عین مطابق ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حکم سے سرچشمۂ نُور نہ صرف ذاتی طور پر پاک وپاکیزہ کہلاتا ہے، بلکہ دُوسروں کے لئے بھی یہی تطہیر وتزکیہ کا ذریعہ اور وسیلہ ہُوا کرتا ہے، چُنانچہ کسی مومن کو اِس حقیقت میں کیا شک ہوسکتا ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم پیدائشی طور پر نُور اور

مُقدّس تھے، اور اسی طرح آپؐ کا خاندانِ عالی مرتبت بھی، یعنی حضرت مولا علیؑ، حضرت فاطمۂ زہراؑ، حضرت حسن مُجتبیٰؑ، حضرت حُسین سیّد الشُّہداؑ، اور سِلسِلۂ نُور کا ہر امامؑ۔

خُدا تعالیٰ کے برگزیدہ بندے کس طرح پیدائشی پاک ہُوا کرتے ہیں؟ اِس کے لئے بہت سے دلائل موجود ہیں، مگر یہاں صرف دو قرآنی شہادتوں سے کام لینا کافی ہوگا، چُنانچہ اِس حقیقت کی پہلی گواہی یہ ہے کہ حضرت زکریّا علیہ السّلام نے ربِّ کریم کی بارگاہ سے ایک پاک ذُرّیّت (اولاد) کے لئے دُعا کی، حالانکہ لفظِ "ذُرّیّت" انسان کا ایک ایسا نام ہے کہ اس کا اطلاق آدمی پر سلسلۂ تخلیق کی ہر کڑی میں ہوتا ہے، پس پیغمبرِ موصوف کی اِس طلب کے یہ معنی ہُوئے کہ اُنھوں نے ایک ایسا فرزند چاہا، جو نہ صرف پشتِ پدر اور شکمِ مادر میں پاک ہو، بلکہ قبل ازیں بھی معصُوم و پاکیزہ رہ چکا ہو، وہ دعا یہ ہے: قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِن لَّدُنكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً (۳/۳۸)، اس جگہ حضرت زکریّاؑ نے دُعا کی اور کہا کہ اے میرے پروردگار مجھے اپنے حضور سے ایک پاک ذُرّیّت (اولاد) عنایت کر دے۔ چنانچہ خداوندِ عالم نے حضرت زکریّاؑ کو ایک معصوم و پاک فرزند عطا کر دیا، جس کا پیارا نام یحییٰؑ تھا۔

دوسری شہادت یہ ہے کہ روح القدس نے ایک کامل و مکمّل انسان کی شکل اختیار کر کے حضرت مریمؑ سے کہا: قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا (۱۹/۱۹) اُس نے

کہا کہ میں تمہارے ربّ کا بھیجا ہُوا (فرشتہ) ہُوں تاکہ تُم کو ایک پاکیزہ لڑکا دوں۔ اِس قرآنی ارشاد سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نہ صرف پیدائش کے وقت ہی معصوم تھے، بلکہ اس سے پہلے بھی ہر طرح سے پاک و پاکیزہ تھے، کیونکہ آپؑ کو نورِ خدا کا درجہ حاصل تھا (۶۱/۶-۸)، پس اس مثال سے یہ دعویٰ حق بجانب ہوگیا کہ پیغمبرِ اکرمؐ اور امامِ عالیمقامؑ پیدائشی طور پر معصوم و پاک ہُوا کرتے ہیں، کیونکہ نورِ نبوّت اور نورِ امامت ہمیشہ سے پاک و پاکیزہ ہوتا ہے۔

سوال: آیۂ تطہیر سے ایسا تأثّر ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ بیت یعنی حضرت محمدؐ، حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن، اور حضرت حُسین صلوات اللہ علیہم کو زمانۂ نبوّت کے کسی سال میں بدرجۂ کمال پاک و پاکیزہ کیا (۳۳/۳۳)، اس سے پہلے نہیں، پھر کوئی کس طرح قبول کرے گا کہ وہ حضرات فطری طور پر پاک تھے؟

جواب: اس سِلسِلے میں سب سے بُنیادی اور عُمدہ بات یہ ہے کہ ہم حضرت خاتم الانبیاءؐ سے قبل کے انبیائے قرآن کو آنحضرتؐ کی گوناگون صفات کے آئینے مانیں، چُنانچہ جب ہم حضورِ انورؐ اور آپؐ کے اہلِ بیت کو آئینۂ عیسیٰؑ میں دیکھتے ہیں تو شروع ہی سے معصوم و پاک نظر آتے ہیں، ہم ایسا اِس لئے کرتے ہیں کہ بموجبِ قرآن (۳۳/۳۳) اہلِ بیت پاکیزگی میں ایک ساتھ ہیں، اور رحمتِ عالم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی عالمگیر صفات نہ صرف آپؐ

کے ظاہری تذکرے میں ہیں، بلکہ دُوسرے پیغمبروں کی اعلیٰ مثالوں میں بھی ہیں، اب آیئے ہم اس پُرحکمت قانُون کے مطابق اہلِ بیتِ عُظّام کی تطہیر کو حضرت عیسیٰؑ کی تطہیر میں دیکھتے ہیں، سو آپ نے اس موضوع کی پہلی قسط میں حضرت عیسیٰؑ کی پاکیزگی سے متعلق آیۂ مُبارکہ (۳/۵۵) کی تاویلی حکمت پڑھی ہوگی کہ اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ آپؑ کے عالمِ شخصی میں اہلِ انکار کے جتنے ذرّات رُوح داخل ہوئے تھے، وہ سب کے سب ہلاک کئے گئے، اور یہ واقعہ اُس وقت رُونما ہو جاتا ہے، جبکہ انسانِ کامل منزلِ عزرائیلی کے عظیم الشّان عجائب و غرائب سے گزرنے لگتا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اور حضرات اہلِ بیتؑ کی تطہیر ان کی ذواتِ عالی صفات کی کسی کدورت کی وجہ سے نہیں، بلکہ منکرین کے ذرّاتِ ارواح کے سبب سے ضروری تھی، کیونکہ انبیاء و اولیاء خانۂ خُدا کا درجہ رکھتے ہیں، لہٰذا اگر اس میں مشرکین داخل ہو گئے تو انھیں نکال دینا ہے، کیونکہ وہ اعتقادی طور پر نجس ہیں (۹/۲۸)، اس قرآنی دلیل سے یہ حقیقت روشن ہوگئی کہ اہلِ بیتِ کرامؑ خُدا کے برگزیدہ بندے ہونے کی بنا پر پیدائشی پاک و پاکیزہ تھے۔

جس نُورِ ازل (صلعم) کو خُدائے پاک و برتر کی جانب سے یہ حکم ملا ہو کہ وہ اہلِ ایمان کی تطہیر و تزکیہ کرے (۹/۱۰۳)، اس کو اِس سے پہلے مُطَہّر اور مُزکّی (یعنی لوگوں کو ظاہر و باطن میں پاک و پاکیزہ کر دینے والا) بنایا گیا ہے، اور یہ فعل دراصل علم و حکمت کی صُورت میں ہے، چنانچہ

اللہ تعالیٰ نے نورِ امامت کو نورِ نبوّت کا جانشین مقرّر فرمایا، تاکہ وہ لوگوں کو نور (یعنی حقیقی علم) کے پانی میں نہلا کر صاف و پاک کرتا رہے اور یہ سلسلہ کبھی منقطع نہ ہو جائے، اور ایسے بہت سے اعلیٰ معنوں میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ کا نور ہمیشہ ضوفشانی کرتا رہے گا ($\frac{9}{32}$، $\frac{61}{8}$، $\frac{57}{28}$) اور اس کو کوئی نہیں بجھا سکتا۔

آپ یہ پُرحکمت اصول ضرور یاد رکھیں کہ علم کی ضد جہل (جہالت = نادانی) ہے، لہٰذا قرآنِ حکیم میں براہِ راست بھی اور گوناگوں مثالوں میں بھی جس کثرت سے علم کا ذکر آیا ہے، اسی طرح اور اتنا زیادہ جہالت کا بھی ذکر ہوا ہے، چنانچہ اگر علم نور ہے تو اس کے مقابلے میں جہالت ظلمت کہلائے گی، خواہ یہ مقابلہ لفظی طور پر ہو یا تصوّراتی کیفیّت میں، اگر علم کا نام یقین رکھنا ہے تو جہل کو شک قرار دینا پڑے گا، اگر اس کو بہشت کہنا ہے تو اُس کو دوزخ کہنا ہوگا، اگر علم کو ہدایت کے اسم سے موسوم کیا گیا تو اُس وقت جہالت کو ضلالت (گمراہی) کا نام دینا ہوگا، اگر شفاء سے علم مُراد ہے تو بیماری کی تاویل جہالت ہوگی، اگر سُننے، بولنے، اور دیکھنے کا اشارہ علم کی طرف ہے تو صُمٌّ، بُکمٌ، عُمیٌ (یعنی بہرے، گونگے، اور اندھے ہیں) میں جاہلوں کی مذمت ہوگی، اور اگر علم سے عقل وجان کی صفائی و پاکیزگی ہوتی ہے تو اس کے برعکس جہالت سے نجاست و غلاظت ہوگی۔

سورۂ رعد ($\frac{13}{29}$) میں درختِ طوبیٰ کا ذکر ہے اور سورۂ

ابراہیم (۲۴/۱۴) میں شجرۂ طیبّہ کا، اور دونوں کے معنی ہیں پاک درخت؛ یہ نورِ امامت کی مثالوں میں سے ہے، کہ امامِ زمانؑ دُنیا و عقبیٰ میں وہ پاک و پاکیزہ علمی درخت ہے، جس کے ثمرۂ طیبّہ کھانے سے مومنین کی پاکیزگی ہو جاتی ہے، یعنی امامِ اقدس اطہرؑ کی تعلیمات و ہدایات کی بدولت غیر ضروری باتیں مومن کے دل و دماغ سے دُھل جاتی ہیں، تاہم تطہیر و تزکیہ کا سلسلہ اتنا طویل ہے، جتنا کہ تعلیم و تربیّت کا سلسلہ ہے، کیونکہ طفلِ مکتب کی طرح بتدریج آگے سے آگے بڑھنے کے لئے لوحِ ضمیر کی تحریر کو دھو کر از سرِ نو لکھنے کا عمل ہر وقت جاری رہتا ہے۔

سورۂ فرقان (۴۸/۲۵) میں اُس پانی کو "طَہُور" یعنی بہت پاک قرار دیا گیا ہے، جو آسمان سے برستا ہے، اس سے رسولِ خداؐ کا وہ علم مُراد ہے؛ جو آنحضرتؐ کے باب (دروازہ) یعنی امامِ برحقؑ سے ظاہر ہوتا ہے؛ کیونکہ آسمانِ رسالت سے جو علم کی بارش برسی تھی، اس کے تمام تر ذخائر کوہِ امامت میں بن گئے ہیں، جس طرح دُنیا کا پہاڑ مادّی قسم کی برف و بارش کو اپنے ظاہر و باطن میں نہ صرف جمع کر لیتا ہے، بلکہ اس کو اصلی حالت میں پاک و پاکیزہ محفوظ بھی رکھتا ہے، سو جو لوگ اِس مُبارک اور عالی شان پہاڑ سے متّصل آباد ہیں، ان کو دینی علم کا یہ پانی جو بہت پاک ہے ہمیشہ مہیّا ہوتا ہے، جس سے ان کی عقل و جان کی پاکیزگی ہوتی رہتی ہے، جیسے سورۂ دہر (۲۱/۷۶) میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اہلِ جنّت کو شرابِ طہور یعنی ایک بہت پاک پینے کی چیز پلائے

گا، پس یہ وہی حقیقی علم ہے، جس کا ذکر ہُوا۔

تطہیر و تزکیہ کے بہت سے مقاصد ہیں، اور ان میں بلند ترین مقصد یہ ہے کہ مومنین کو اسرارِ معرفت تک رسائی ہو، جبکہ معرفت کے بھید قرآنِ حکیم کی تاویل میں پوشیدہ ہیں، اور قرآنی تاویل امامِ زمانؑ کے مرتبۂ باطن (نورٌ) میں ہے، جس کا ایک نام "کتابِ مکنون" ہے، جس کو کوئی شخص دستِ عقل سے چھو نہیں سکتا، مگر صرف ایسے لوگ جو عقلی اور علمی حیثیّت میں پاک کئے گئے ہیں (۵۶-۷۷-۷۹) چُنانچہ اسلام میں جتنی عبادات و مُعاملات ہیں، وہ سب اسی آخری مقصد کے پیشِ نظر ہیں، کہ معرفتِ توحید کے نتیجے میں مومنوں کو گنجِ مخفی حاصل ہو۔

سورۂ فاطر میں ارشاد ہے: پاکیزہ باتیں اسی کی طرف چڑھتی ہیں اور نیک عمل ان کو اُٹھاتا ہے (۳۵/۱۰)۔ اس پُرحکمت آیت کا اشارہ یہ ہے کہ جب امامِ برحقؑ کی طرف سے مومنین و مومنات کی عقل و جان اور اقوال و اعمال کی تطہیر مکمّل ہو، تو اُس وقت اُن کی رسائی عالمِ عُلوی سے ہوگی، جس کے لازوال خزانوں کو دیکھ کر اُن کو بیحد مسرّت و شادمانی حاصل ہوگی۔

سورۂ نحل کے ایک پُرحکمت ارشاد (۱۶/۳۲) کو دیکھئے، جس کے خاص و عام دو پہلو ہیں، چُنانچہ یہاں اس کے خاص پہلو کے مطابق بات کی جاتی ہے، وہ یہ کہ کامل انسان پاک و پاکیزہ ہُوا کرتے ہیں، لہٰذا ان کی رُوحانی ترقّی کسی رکاوٹ کے بغیر آگے بڑھتی ہے، اور اس سلسلے میں ان کی انفرادی

قیامت (جس میں ایک اجتماعی قیامت بھی پوشیدہ ہے) برپا ہو جاتی ہے، اس وقت فرشتے آکر ان کی رُوح کو قبض کر لیتے ہیں، درحالیکہ وہ زندہ ہوتے ہیں، فرشتے ان سے گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تم پر سلامتی ہے، اب تم اپنی نیکوکاری کی بدولت بہشتِ رُوحانیّت میں داخل ہو جاؤ۔

نصیرالدین نصیرؔ ہونزائی

۲۰- فروری ۱۹۸۵

ISW
LS
Institute for
Spiritual Wisdom
and
Luminous Science
Knowledge for a united humanity

خانۂ خُدا - خانۂ جماعت

(پہلی قسط)

اسلام اپنی روح میں کامل و مکمّل دین ہے، اس میں رشد و ہدایت اور علم و حکمت کی فراوانی ہے، اِس کا ہر قول و عمل اور ہر چیز ظاہراً و باطناً عقلی اور روحانی خوبیوں سے مالامال اور یقین و معرفت کے اشارات سے بھر پور ہے، چُنانچہ آج ہم یہاں عنوانِ بالا (خانۂ خُدا - خانۂ جماعت) سے بحث کرتے ہیں، اور یہ معلوم کر لینا چاہتے کہ آیا ذاتِ سبحان تحقیقت کسی گھر کے لئے محتاج ہے یا اس کی حاجت و ضرورت دراصل اہلِ ایمان کو ہے؟ اگر اس کا جواب یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ جو کون و مکان کا خالق و مالک ہے، وہ مکان و لامکان سے بے نیاز و برتر ہے، سو اس حال میں یہ سوال ہوگا کہ اگر خانۂ خُدا کا یہ تعیّن لوگوں کی دینی ضرورت کے پیشِ نظر ہے تو پھر بتائیے کہ اس سے ان کو کیا کیا فائدے حاصل ہوتے ہیں؟ اور اس میں کیا کیا اسرار پنہاں ہیں؟ اس کا مفصّل جواب ذیل میں درج ہے:۔

۱۔ جا و جہت یا مکان و زمان کے اعتبار سے خُدا کا تصوّر تین

درجوں پر مبنی ہے، اوّل یہ کہ گویا خُدا وند تعالیٰ ایک خاص گھر میں جلوہ نما ہے، جس طرح بیت اللہ کا تصوّر ہے (۲۲/۲۶)، دُوسرا یہ کہ وہ ہر جگہ موجُود ہے (۲/۱۱۵) اور تیسرا یہ ہے کہ وہ مکان و لامکان سے بے نیاز و برتر ہے، کیونکہ وہ سُبحان، قدوس، اور صمد ہے، اور یہ حقیقت مُسلّمہ اور نا قابلِ تردید ہے، چونکہ اِسلامی تعلیمات و ہدایات تدریجی صُورت میں ہیں، لہٰذا یہ امر ضروری قرار پایا کہ ہر فردِ مُسلم سب سے پہلے خانۂ خُدا کے عقیدۂ راسخ کو اپنائے، اور اُس سے وابستہ ہو جائے، تاکہ اس کو یہیں سے اللہ تبارک و تعالیٰ کی وحدانیت کی معرفت حاصل ہو، اور اگر کوئی شخص اِس بُنیادی تصوّر کی حکمت کو نہیں سمجھتا، اور اسے نظر انداز کرتا ہے، تو وہ دُوسرے اور تیسرے تصوّر کے خزانوں کو براہِ راست حاصل نہیں کر سکتا، کیونکہ خُدائی قانون کے خلاف چلنا باعثِ نامُرادی ہے۔

۲۔ اِسلام میں جس طرح عرشِ عظیم کا تصوّر ہے، وہ بھی دینِ حق کی جُملہ حکمتوں کا مرکز ہے، اُس سے نہ صرف خُدا کے گھر کی عظمت و بزرگی کا ثبوت مِل جاتا ہے، بلکہ ساتھ ہی ساتھ اس بہت بڑی فضیلت کا یقین بھی ہو جاتا ہے کہ جو مؤمنین زمین پر خانۂ خُدا کی آبادی و ترقّی کے کاموں میں لگے ہوتے ہیں، وہ عالمِ بالا کے ان پاکیزہ فرشتوں کی طرح ہیں، جو عرشِ الٰہی سے متعلّق ہیں یا اُس کے گرداگرد طواف کرتے ہیں، اِس بیان سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی کہ جس طرح خانۂ خدا کی نزدیکی

اور شناخت سے انسانوں کو فائدہ ہے، اسی طرح عرشِ اعلیٰ کی قربت و معرفت سے فرشتوں کو فضیلت حاصل ہوتی ہے، مگر اللہ سُبحانہٗ و تعالیٰ ہر شئ سے بے نیاز و برتر ہے۔

۳۔ خُدائے واحد کی ذاتِ پاک و منزّہ اُس وقت بھی تھی، جبکہ خانۂ کعبہ نہ تھا، اور بیت اللہ کی تعمیر اُس وقت ہُوئی، جبکہ حضرت آدم علیہ السّلام کے سیّارۂ زمین پر اُترنے کا وقت آیا، چُنانچہ خُداوندِ عالم کے امر سے فرشتوں نے خانۂ خُدا کی تعمیر کی، تاکہ آدمؑ و اولادِ آدمؑ اس سے رجوع کر کے رُوحانی فائدے حاصل کریں، اس سے معلوم ہوا کہ دین کی اصل و اساس خانۂ خُدا ہے، اور یہی خُدا کا گھر خانۂ دین اور خانۂ جماعت بھی ہے، جس کی اردو عبارت "جماعت خانہ" ہے "خُدا کا گھر" کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں انوار و اسرارِ خداوندی کا ظہور اور فیوض و برکات کا نزول ہوتا رہتا ہے، تاکہ مومنین ہمیشہ خُدا کے اِس گھر میں جا کر مستفیض ہوتے رہیں اور روز بروز علم و عمل میں ترقّی کرتے جائیں۔

۴۔ خانۂ کعبہ جس میں عظیم تاویلی حکمتیں پوشیدہ ہیں اپنی جگہ بیحد ضروری ہے تاکہ جُملہ مُسلمانانِ عالم اس کی ظاہری و باطنی حکمتوں کو سمجھتے ہُوئے باہمی اِتفاق و یکجہتی کی دولت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں، اور زمانۂ نبوّت کے مُسلمانوں کی طرح سب کے سب سلکِ وحدتِ ملّی سے منسلک ہی رہیں، اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی ضروری تھا کہ ذیلی طور پر ہر مُسلم قریہ میں خُدا کا ایک گھر بنایا جائے، کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں

کہ دُور دراز ممالک کے مُسلمین روزانہ عبادت کے لئے خانۂ کعبہ میں پہنچ جائیں چُنانچہ سرورِ انبیاء صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے مسجد کے نام سے خُدا تعالیٰ کا مقامی گھر بھی بنا دیا، یہ صرف ایک چار دیواری تھی، جس میں تین طرف دروازے تھے .... آنحضرت کے بعد جتنی نئی مسجدیں تعمیر ہُوئیں، سب کا بُنیادی ڈھانچہ یہی رہا، رفتہ رفتہ مسجد کی تعمیر مُسلمانوں میں ایک فن بن گئی، اِس طرح ایک خاص طرزِ تعمیر کا ارتقاء ہُوا ....

(فیروز سنز - اُردو اِنسائیکلوپیڈیا)

۵- قبلۂ اِسلام کے کئی نام ہیں، جیسے کعبہ، جس کے لفظی معنی ہیں چار گوشہ مکان (۵/۹۵) البیت (گھر ۲/۱۲۵) البیت العتیق (قدیم گھر ۲۲/۲۹) بیت اللہ (خُدا کا گھر ۲/۱۲۵)، بَیْتٍ وُضِعَ لِلنَّاس (وہ گھر جو لوگوں کے واسطے مقرر کیا گیا ۳/۹۶) البیت الحرام (حُرمت والا گھر ۵/۲) المسجد الحرام (حُرمت والی مسجد ۱/۱۴۴) وغیرہ۔

خانۂ خُدا کے مذکورہ اسماء میں کسی ابہام کے بغیر یہ جواز موجود ہے کہ جس طرح مسلمانوں کی عبادت گاہ کا نام مسجد درست ہے، اسی طرح اس کا نام "جماعت خانہ" بھی درست ہے، یعنی جماعت کا مذہبی گھر، کیونکہ اللہ کا گھر لوگوں کا دینی گھر ہُوا کرتا ہے، جبکہ بیت اللہ لوگوں کے لئے مقرر ہے (۳/۹۶) جب ہم تاریخی تحقیق (ریسرچ) کی روشنی میں زمانۂ نبوّت کو دیکھتے ہیں، تو اس میں باعتبارِ شکل مسجد اور جماعت خانہ ایک ہی چار دیواری نظر آتی ہے، چُنانچہ میرے نزدیک مسجدِ رسولؐ

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science

خدا کا مقامی گھر اور حال و مستقبل کا جماعت خانہ تھی، جس کو اللہ پاک کے مرکزی گھر کی نمائندگی حاصل تھی۔

۶۔ مسجد کے معنی ہیں جائے سجدہ (سجدہ کرنے کی جگہ) عبادت خانہ، نیز اس کے معنی ہیں عبادت، اور اس کی تاویل ہے اسمِ اعظم، اساسؑ اور امامِ زمانؑ، کیونکہ ربّ العالمین کا حقیقی اسمِ اعظم اور عقل و جان والا گھر ہادیٔ زمان ہوا کرتا ہے، جیسا کہ کتابِ دعایم الاسلام جلد اوّل (عربی) کتابِ حج کے سلسلے میں صفحہ ۲۹۲ پر ذکر ہے کہ فرشتوں نے خانۂ خدا کی تعمیر کی، اس کے یہ معنی ہیں کہ ملائکہ نے انسانِ کامل کے عالمِ شخصی میں بیت اللہ کی روحانی تعمیر کی، کیونکہ فرشتوں کا اصل کام روحانی قسم کا ہوتا ہے، اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ فرشتوں نے واقعی کعبۂ ظاہر کو بنایا تھا، تو اس کی تاویلی حکمت یہ ہوگی کہ مومنین نے جو جسمانی فرشتے ہیں عالمِ جسمانی میں ایک جماعتخانہ بنایا، اور "جیسا عمل ویسا بہترین ثواب" کے قانون کے مطابق ان کے ہاتھ سے روحانیت میں کعبۂ جان کی تعمیر کروائی گئی۔

۷۔ حضرت ابراہیمؑ نے بیت اللہ کی تعمیر تو اسی مقام پر کیا جہاں یہ طوفانِ نوحؑ سے پہلے تھا، اس جگہ کی نشاندہی ایک ایسی ہوا نے کی جو حضرت ابراہیمؑ کی تسکین کے لئے خداوند تعالیٰ نے بھیجی تھی جس کا نام سکینہ تھا، اس ہوا کے دو سر تھے، جو ایک دوسرے کے پیچھے گھومتے تھے، جس کی تاویل ذکرِ خدا اور اس کی روحانیت ہے، اس سے یہ

سکینہ (۴۸/۲۶)

حقیقت نمایاں ہو جاتی ہے کہ اللہ کے خانۂ ظاہر کے تاویلی پسِ منظر میں خانۂ نورانیت کا تذکرہ موجود ہے، کیونکہ ہر ظاہر کا ایک باطن ہوا کرتا ہے، جیسا کہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاسبغ علیکم نِعمةً ظاھِرةً وّباطِنةً (۳۱/۲۰) اور اُس نے تم پر اپنی نعمتیں ظاہری اور باطنی پوری کر رکھی ہیں۔

۸۔ اللہ تعالیٰ پاک فرمان ہے: واذ جعلنا البیت مثابةً لِلنّاسِ وامنا ط واتّخذوا مِن مقامِ ابراھیمَ مُصلّی (۲/۱۲۵) اور جس وقت ہم نے خانۂ کعبہ کو لوگوں کے لئے جائے ثواب اور مقامِ امن مقرر کر رکھا اور مقامِ ابراہیمؑ کو جائے نماز بنا لیا کرو۔

اِس آیۂ کریمہ کی پہلی تاویل: جس طرح خُدا کے حُکم سے خانۂ کعبہ ظاہر میں ثواب اور امن کی جگہ ہے، اِسی طرح امامِ زمان صلوات اللہ علیہ باطن میں بیت اللہ کی حیثیت سے ہر قِسم کے ثواب کا وسیلہ اور ہر طرح کے امن کا ذریعہ ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہُوا کہ امامِ برحقؑ قبلۂ باطن ہیں، جس کی طرف قلبی توجّہ ہر نیک کام میں لازمی ہے، اور طریقِ ثواب یہی ہے، آپ دیکھتے ہیں کہ ثواب کا ذکر پہلے ہے اور امن کا

ذکر بعد میں، اس کی حکمت یہ ہے کہ پہلے مومنین امام اقدس واطہرؑ کی اطاعت و فرمانبرداری سے ثواب ونیکی کے مراحل طے کرلیتے ہیں، پھر نتیجے کے طور پر امام عالیمقامؑ کی روحانیّت کو نورانیّت میں داخل ہوجاتے ہیں، اور یہی اللہ تبارک وتعالیٰ کا خانۂ باطن ہے، جس میں امن ہی امن ہے، یعنی کوئی خوف و خطر نہیں۔

جس طرح ظاہر میں مقامِ ابراہیمؑ خانۂ کعبہ کی ایک ایسی جگہ ہے، جہاں ایک پتّھر تھا، اسی طرح خانۂ باطن یعنی امامِ مبینؑ کی نُورانیت میں ایک عقلی گوہر ہے، اُس تک رسائی حاصل کرکے نماز کی حکمتوں کو حاصل کرلینے کے لئے فرمایا گیا ہے۔

دُوسری تاویل: جس طرح خانۂ کعبہ اللہ کا مرکزی گھر ہے، اسی طرح جماعت خانہ خُدا کا مقامی گھر ہے، یا یُوں کہا جائے کہ جیسے بیت اللہ شریف مقامِ شریعت پر ہے، ویسے مقدّس جماعت خانہ مقامِ حقیقت پر ہے، لہٰذا مذکورہ آیۂ کریمہ میں جو فضائل بیان ہوئے ہیں، وہ خُدا کے اِس گھر کے بارے میں بھی ہیں، جو جماعت خانہ کے نام سے مشہور ہے، چُنانچہ عقیدۂ اسماعیلیّت اور قرآنی حکمت کے مطابق جماعت خانہ جائے ثواب اور مقامِ امن ہے، اِس کے معنی یہ ہیں کہ دین کے کُل اوامر و نواہی کا جُملہ ثواب جماعتخانہ میں مرکوز ہے، اور رُوحانی امن وسکُون بھی اسی میں ہے، کیونکہ جماعت کے اِس خانہ۔ دین کو دُہری فضیلتیں حاصل ہیں کہ یہ اگر ایک جانب سے خانۂ کعبہ کا نمائندہ ہے، تو دوسری جانب

سے امام برحقؑ کی مثال ہے، جبکہ امامؑ نے بمنشائے الٰہی اپنی شخصیّت اور ظاہری و باطنی قربت کی جگہ جماعت خانہ دیا ہے، پس مرحلۂ اوّل میں جماعت خانہ کے لئے یہی مقامِ ابراہیم ہے۔

۹۔ سورۂ آلِ عمران (۳/۹۶) میں ربِّ عزّت کا فرمان ہے: اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ (۳/۹۶) یقیناً وہ مکان جو سب سے پہلے لوگوں کے واسطے مقرّر کیا گیا وہ مکان ہے جو کہ مکّہ میں ہے جس کی حالت یہ ہے کہ وہ برکت والا ہے اور جہان بھر کے لوگوں کے لئے رہنما ہے۔ اس آیۂ مبارکہ میں کئی حکیمانہ اشارات ہیں، منجملہ ایک اشارہ یہ ہے کہ "اوّل" اعدادِ ترتیبی (ORDINALS) کی بُنیاد ہے، اور اس کا تقاضا ہمیشہ یہ ہُوا کرتا ہے کہ اوّل (پہلا) کے بعد دُوسرا، تیسرا، چوتھا، پانچواں وغیرہ بھی ہو، اس کا مفہوم یہ ہُوا کہ اگرچہ لوگوں کا اوّلین اور مرکزی گھر مکّہ میں ہے، تاہم زمانۂ نبوّت اور دَورِ امامت میں ذیلی اور مُقامی طور پر بہت سے گھر (جماعتخانے) ہوں گے۔

دُوسرا اشارہ یہ ہے کہ جس طرح لوگوں کے واسطے اوّلین دینی گھر مکّہ میں مقرّر ہُوا، اِسی طرح امامِ اوّل (مولا علیؑ) بھی مکّہ میں مقرّر ہوئے، جو لوگوں کے لئے رُوحانیت و نُورانیت کا گھر ہیں، جس میں اُن لوگوں کے لئے برکات وہدایات ہیں، جو عالمِ شخصی بن جاتے ہیں۔

تیسرا اشارہ یہ ہے کہ "بَکَّۃَ" کا ایک اِشاراتی قرأت گریہ وزاری کے معنی میں بھی ہے، سو اس کا تاویلی مفہوم یہ ہے کہ لوگوں کے لئے اوّلین

رُوحانیّت کا گھر عشقِ مولا کے تابناک آنسوؤں سے بنایا جاتا ہے، جو اہلِ دل کے لئے برکتوں اور ہدایتوں سے بھرپور ہے۔

چوتھا اشارہ یہ ہے کہ خانۂ کعبہ، امامؑ، اور جماعت خانہ اگر ایک طرف سے خُدا کے گھر ہیں تو دُوسری طرف سے لوگوں کے گھر ہیں، کیونکہ ان پاک گھروں میں جو برکتیں اور ہدایتیں ہیں، وہ لوگوں کے لئے ہیں، اور ان کا خُدا تعالیٰ سے منسُوب ہو جانا خصُوصی ملکیّت کی وجہ سے ہے۔

۱۰۔ سورۂ نُور میں فرمایا گیا ہے: فِي بُيُوتٍ أَذِنَ اللَّهُ أَن تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ يُسَبِّحُ لَهُ فِيهَا بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ (۲۴/۳۶) (وہ نُور) ایسے گھروں میں روشن ہے جن کی نسبت خدا نے حکم دیا ہے کہ ان کی تعظیم کی جائے اور ان میں اس کا نام لیا جائے جن میں صبح و شام وہ لوگ اس کی تسبیح کیا کرتے ہیں۔ اِن گھروں سے حضراتِ ائمۂ طاہرین صلوات اللہ علیھم مُراد ہیں، نیز یہ گھر جماعتخانے ہیں، جن میں نورِ خداوندی کا چراغ روشن ہوتا ہے، جس کا مشاہدہ اور عرفان یقینی ہے۔

۱۱۔ خانۂ کعبہ ظاہری علامت، مثال اور نمونہ ہے اُن آیاتِ کریمہ کا، جن کی تاویلی حکمت کا تعلق خُدا تعالیٰ کے زندہ گھر یعنی امام علیہ السّلام سے ہے، اور امام عالیمقامؑ کی معرفت جو نہایت ہی ضروری ہے، وہ کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی، مگر اطاعت سے، اور اطاعت و فرمانبرداری کا مرکز جماعت خانہ ہے، کیونکہ یہ جائے ثواب اور مقامِ امن ہے۔

جس طرح ہر چیز کی رُوح ہوا کرتی ہے، اِسی طرح جماعت خانہ

کی ایک عظیم رُوح ہے، یہ امام زمانؑ کی رُوح یعنی نور ہے، جس میں جماعتی رُوح زندہ ہو جاتی ہے، پس اگر آپ باور کرتے ہیں کہ جماعت خانہ میں امامِ برحقؑ کا نور موجود ہے، تو یہ بھی جان لیں کہ یہی نور اللہ تعالیٰ کا زندہ گھر ہے، جیسا کہ قرآنِ پاک کا ارشاد ہے:۔

قَدْ کَانَتْ لَکُمْ أُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ فِیْٓ اِبْرٰھِیْمَ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ (۶۰:۴) تمہارے واسطے تو ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں (کے قول و فعل) کا اچھا نمونہ موجود ہے۔ اِس ربّانی تعلیم سے یقینی طور پر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ویسے تو ظاہر میں حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے ساتھ بہت سے لوگ تھے، مگر جو حضرات باطن میں آپ کے ساتھ تھے، وہ آپؑ کی پیروی میں درجۂ انتہا پر پہنچ گئے تھے، اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کا اُسوۂ حسنہ حضرت ابراہیمؑ کے اُسوۂ حسنہ سے نہیں مِلتا، اب پُوچھنا یہ ہے کہ ایسے حضرات کون تھے یا کون ہیں؟ آلِ ابراہیمؑ ہیں، یعنی انبیاء و ائمہؑ علیہم السّلام، جن کا ظہور جناب خلیل اللہؑ کے نزدیک بہت ہی ضروری تھا (۱۲۴:۲) اور خُدائے مہربان نے آلِ ابراہیم کو سب کچھ دے رکھا تھا (۵۴:۴) چُنانچہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے بحکمِ خُدا حضرت ابراہیمؑ کی پیروی کرتے ہُوئے نہ صرف خانۂ کعبہ کو قبلہ بنا، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ مقامی طور پر بھی خُدا کا ایک گھر (مسجد) بنایا، اور پاک اماموں نے بھی اپنے اپنے وقت میں مسجد یا جماعتخانہ کے نام سے اللہ کے ایسے گھروں کی تعمیر کی۔

۱۲۔ سورۂ قصص (۲۸/۵۷) میں فرمایا گیا ہے: کیا ہم نے ان کو امن و امان والے حرم میں جگہ نہیں دی جہاں ہر قسم کے پھل کھنچے چلے آتے ہیں جو ہمارے پاس سے کھانے کو ملتے ہیں ولیکن ان میں اکثر لوگ نہیں جانتے (۲۸/۵۷) اگر آپ غور کریں تو صاف طور پر معلوم ہو جائے گا کہ ثمرات کلّ شیئٍ یعنی تمام چیزوں کے ظاہری میوے کہیں بھی خود بخود کھنچ کھنچ کر نہیں آسکتے، مگر یہ حقیقت ہے کہ پیغمبر اور امام صلوات اللہ علیہما جس جگہ کو عبادت کے لئے مقرر فرمائیں، وہاں کُل اشیاء کے رُوحانی میوے کھنچ کھنچ کر خُود بخُود آتے رہتے ہیں، اور یہی روحانی معجزات جماعتخانہ سے متعلّق ہیں۔

جب قرآنِ حکیم نے کہا کہ ثمراتُ کُلّ شیئٍ (جُملہ اشیاء کے میوے) تو اس خُداوندی کُلیّہ کے مطابق جمادات، نباتات، حیوانات اور انسان سب کے سب درخت قرار پائے، تاکہ ان میں سے ہر ایک کا پھل خانۂ خُدا کی طرف آئے، مگر یہ صرف اور صرف رُوحانی صُورت میں ممکن ہے، چنانچہ جماعت خانہ وہ مقام ہے، جہاں امامِ زمان ع کی عظیم المرتبت روح (یعنی نور) کام کرتی ہے، جس کی طرف دُنیا بھر کی چیزوں کی روحیں کھنچ کر آتی ہیں، جیسا کہ امامِ مبین میں اشیائے کائنات جمع ہوتی ہیں (۳۶/۱۲) پس حقیقی مومنین کے لئے جماعتخانہ سے متعلّق یہ روشن دلائل کافی ہیں۔

نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی

۱۰۔ دسمبر ۱۹۸۴ء

خانۂ خُدا — خانۂ جماعت

(دُوسری قسط)

۱۔ اِس حقیقت میں کوئی شک نہیں کہ خانۂ خُدا خانۂ جماعت ہے، اور نہ ہی اِس بات میں کوئی شُبہ ہے کہ جس طرح دین کا مرکزی گھر خانۂ کعبہ ہے اسی طرح مقامی گھر جماعتخانہ ہے، اور یہ نظام اللہ تعالیٰ کی سُنّت اور قانُونِ فطرت کے عین مطابق ہے، کہ ہمیشہ رحمتوں اور برکتوں کا مقام ظاہراً و باطناً بندوں سے قریب تر کردیا جاتا ہے، جیسے حضرت آدم علیہ السّلام کے اِس دُنیا میں آنے کے ساتھ ساتھ آپؑ اور آپؑ کی اولاد کی خاطر یہاں خانۂ خُدا کی تعمیر کی گئی، جو اِس زمین پر عرشِ عظیم کا درجہ رکھتا ہے، کیونکہ خدا کے عرش (تخت) کا جو مفہوم ہے، وہی مفہوم خدا کے گھر کا بھی ہے، اور جیسے رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے ہجرت کے بعد مدینۂ منوّرہ میں اللہ پاک کا ایک دوسرا گھر بنایا، جس کو ہم پہلی مسجد بھی کہہ سکتے ہیں اور اوّلین جماعت خانہ بھی، کیونکہ فی الاصل ان دونوں کی تشکل اور حقیقت ایک ہی ہے، بہرحال وہ خدا کے قدیم گھر کا قائم مقام تھا، اِس کے

یہ معنی ہوتے کہ خانۂ کعبہ کو عرشِ عظیم کی نمائندگی حاصل ہے، اور جماعت خانہ کو کعبۂ شریف کی نمائندگی۔

۲۔ آپ اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ اسلام میں تقویٰ کی بہت اہمیّت ہے، کیونکہ تقویٰ جملہ عبادات کی جان ہے، اور اس مقصد کے حصُول کے لئے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے، مگر شعَائِرِ اللّٰہ یعنی خُدا کی نشانیوں کی شانِ رحمت دیکھئے کہ ان کی حُرمت و تعظیم سے قلبی تقویٰ کا عمل بن جاتا ہے (۲۲/۳۲) امامِ زمان صلوات اللہ علیہ وسلامہ، جو قرآنِ ناطق ہیں، ان کی پاک و پاکیزہ شخصیّت اور جماعت خانہ شعائر اللہ میں سے ہیں، لہٰذا ان کی تعظیم کرنا قلبی تقویٰ کا نتیجہ بھی ہے اور درجہ بھی، کیونکہ ان میں سے ایک خدا کا باطنی گھر ہے اور دوسرا ظاہری گھر۔

۳۔ سورۂ حج کے ایک ارشاد (۲۲/۲۶) کا تاویلی مفہوم یہ ہے کہ خُدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو بیت اللہ قرار دیا تھا، تاکہ اس مرتبہ کی روحانیّت و نورانیّت میں توحید کی معرفت حاصل ہو، اور خدا کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کیا جاتے، ربّ العزّت نے آپؑ کو یہ بھی حکم دیا کہ آپ اللہ کے اس زندہ گھر کی نظریاتی، روحانی اور عقلی پاکیزگی کریں تاکہ اس میں تین قسم کے فرشتے آجائیں، اور وہ ہیں طواف کرنے والے قیام یا اعتکاف کرنے والے، اور رکوع و سجود کرنے والے۔

۴۔ پیغمبر اور امام کی پاک شخصیّت میں روحانی مسجد اور نورانی جماعت خانہ ہونے کا خدائی قانون ہمیشہ سے جاری ہے، جیسے حضرت

نوح علیہ السّلام نے اِس خانۂ نُورانیّت کو "بَیْتِیَ (۲۸/۱)" کہا، اور مومنین میں سے جو افراد اس میں داخل ہو چکے تھے، وہ "اھلِ بیت" کہلاتے تھے وہ قرآنی ارشاد یہ ہے:۔

رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَیْتِیَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ (۲۸/۷۱) اے میرے ربّ مجھ کو اور میرے ماں باپ کو اور جو کمالِ ایمان سے میرے (روحانی) گھر میں داخل ہو گئے ہیں ان کو اور تمام مسلمان مردوں اور مُسلمان عورتوں کو بخش دے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ حضرت نوحؑ کی اس پُرحکمت دُعا میں اہلِ ایمان دو درجوں میں ہیں، یعنی بعض مومنین کمالِ ایمان کی بدولت آپؑ کے خانۂ نُورانیّت (یعنی خانۂ خُدا) میں داخل ہو چکے ہیں، اور بہت سے مومنین و مومنات ہنوز اِس درجے میں داخل نہیں ہو سکے ہیں۔

۵۔ پیغمبرِ خُدا صلّی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلّم اپنے وقت میں خُدا تعالیٰ کا زندہ گھر (۲۲/۲۶) اور نُورانیّت سے بھرپُور معجزاتی جماعت خانہ تھے، جیسا کہ سورۂ احزاب (۳۳/۳۳) میں فرمایا گیا ہے: اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا (۳۳/۳۳) اللّٰہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ اے (نُورانیّت کے) گھر والو تُم سے آلودگی کو دُور رکھے اور تم کو (ہر طرح سے ظاہراً و باطناً) پاک و صاف رکھے۔ یہ مقدّس گھر نُورِ نبوّت و امامت تھا، اور اہلِ بیت (گھر والے) پنجتن پاک تھے، یعنی حضرت مُحمّدؐ مُصطفٰے، حضرت علیؑ مُرتضٰے، حضرت فاطمۂ زہراؑ،

حضرت حسنِ مجتبےٰ اور حضرت حسینِ سیّد شہداء، صلوات اللہ علیہم، یہی خانۂ نورانیت اللہ تعالیٰ کا بولنے والا گھر اور عقلی و رُوحانی جماعت خانہ ہے اور یہی وہ حکمت کا گھر ہے، جس کے بارے میں آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ: "میں حکمت کا گھر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہے۔" نیز یہ وہی مُبارک و مقدّس گھر ہے، جس میں بموجبِ آیۂ قرآن (۲۴/۳۵) نورِ خداوندی کا چراغ روشن ہے۔

۶۔ یہاں متعلقہ حقیقت کو دِل نشین انداز میں پیش کرنے کی غرض سے یُوں سوال کیا جاتا ہے کہ صراطِ مُستقیم (راہِ راست) کس کی ہے؟ آیا یہ خُدا کی ہے یا انبیاء کی؟ کیا یہ راہ آنحضرتؐ کی ہے یا امامؑ کی؟ کیا یہ مومنین کے لئے نہیں ہے؟ اِس کا جواب اِس طرح سے ہے کہ صراطِ مُستقیم سب سے پہلے خُدائے پاک و برتر کی ہے، کیونکہ راہِ راست کی منزلِ مقصود وہی ہے، یعنی سب کو اسی کے خانۂ نور میں جانا ہے (۴۲/۵۳، ۲/۱۵۶) نیز صراطِ مُستقیم جُملہ انبیاء علیہم السّلام کی ہے، کیونکہ وہ حضرات اس پر لوگوں کے رہنما تھے (۱/۷، ۴/۶۸) یہ راہِ راست پیغمبرِ آخر زمان صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی ہے، اِس لئے کہ حضورؐ سرورِ انبیاء و سردارِ رُسل ہیں (۱۲/۱۰۸) نیز یہ رستہ امامِ عالیمقام علیہ السّلام کا ہے، کہ آپ ہادیٔ برحق ہیں (۱۳/۷) اور یہ بھی حقیقت ہے کہ صراطِ مستقیم مومنین کی ہدایت کے لئے بنائی گئی ہے (۴/۱۱۵) بالکل اسی طرح وہ انتہائی پاک و پاکیزہ گھر جو ربّ العزّت کا ہے، وہ مذکورۂ بالا تمام درجات

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

کا ہے، اگرچہ ذاتِ خُدا ئے بے مثل مکان اور لامکان سے بے نیاز و برتر ہے لیکن اس کی وحدانیت کی معرفت خانۂ نُورانیّت سے باہر ممکن نہیں (۲۴/۳۵) یہ گھر جو رحمتوں اور برکتوں سے مملو اور نورِ معرفت سے منوّر ہے وہ انبیاء و أئمّہ علیھم السّلام کا نُور ہے (۲۴/۳۶) اور یہی نوُر سے معمور گھر مومنین و مومنات کا بھی ہے، جبکہ وہ مکمّل پیروی کرتے ہیں (۵۷/۱۲، ۶۶/۸)

۷۔ قانونِ فطرت (پیدائش) یہ ہے کہ ہر چیز ابتداءً ایک محدُود سانچے میں بنتی ہے، اس کے بغیر کسی چیز کا وجود میں آنا غیر ممکن ہے، درختوں کا پھل چھلکے کے بغیر اور مغز گٹھلی کے سوا نہیں بن سکتا، اور جس طرح انسان کی ہستی و شکل اپنی ماں کی بچہ دانی سے باہر نہیں بن سکتی ہے، اور دُوسری طرف سے آپ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بعض اشیاء موجُود تو ہیں، مگر اُن کی کوئی مخصُوص شکل و صُورت نہیں، کیونکہ وہ سانچے کے بغیر بکھری ہُوئی ہیں، جیسے عناصرِ اربعہ، یعنی مٹّی، پانی، ہوا، اور آگ، چُنانچہ بحکمِ خُدا رسُول اللہؐ اور صاحبِ امر نے اللہ تبارک و تعالیٰ کا ایک مقامی گھر بنا دیا، تاکہ اسی سانچے میں ڈھل کر ہر مرید بحقیقت مومن کہلائے اور اس کی ایک خاص ایمانی اور رُوحانی صُورت بن جائے۔

۸۔ جہاں رحمتِ کُل کے قانُون کی رُو سے یہ ممکن ہے کہ عرشِ عظیم کا ایک نمونہ بصُورتِ خانۂ کعبہ زمین پر اُتارا جائے، پھر زمانۂ طوفان میں آسمانِ چہارم پر اُٹھایا جائے، پھر زمانۂ ابراہیمؑ میں زمین پر اس کی تعمیرِ نَو ہو سکتی ہو، اور پھر عہدِ نبوّت میں جہاں مقامی طور پر بھی خدا کا

ایک گھر بنایا جا سکتا ہو، تو وہاں یہ بھی ممکن ہے کہ جماعت خانہ خدائے مہربان کے خانۂ ظاہر یعنی کعبۂ شریف اور خانۂ باطن (امامؑ) کی حقیقی نمائندگی کرے اور یہ بات حق و حقیقت ہے، اور اس میں ذرّہ بھر شک نہیں۔

۹۔ جماعت خانے تین ہیں پہلا عالمی جماعت خانہ، جو امامِ زمان صلوات اللہ علیہ کا مُبارک وجود ہے، دوسرا مقامی جماعت خانہ، جو شہر یا قصبہ یا گاؤں یا محلّے کا جماعت خانہ ہے، اور تیسرا انفرادی جماعت خانہ، جو بندۂ مومن کا دل ہے، مگر اِن تینوں کی مربوط حکمت مقامی جماعت خانے میں ہے کہ وہیں پر رفتہ رفتہ روحانی ترقّی ہوتی ہے، اور قلبی جماعت خانے کا دروازہ کُھل جاتا ہے، پھر وہ نورِ ایمان سے متوّر ہو جاتا ہے، اور اسی میں امامِ اقدس و اطہرؑ کا پاک دیدار رہتا ہے، جو نورانیّت کا حقیقی جماعت خانہ ہے۔

۱۰۔ سورۂ یُونس (۱۰/۸۷) میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۰/۸۷) اور ہم نے مُوسیٰؑ اور ان کے بھائی (ہارونؑ) کے پاس وحی بھیجی کہ مصر میں اپنی قوم کے لئے گھر بناؤ اور اپنے اپنے گھروں ہی کو مسجدیں قرار دے کر پابندی سے نماز پڑھو اور مومنین کو خوشخبری دے دو۔ ہر ایسے شہر کو مِصر کہتے ہیں جس کے گرداگرد فصیل (شہر پناہ) ہو اس سے شہرِ رُوحانیت مُراد ہے، کیونکہ

اس کے گرداگرد نہ صرف فصیل ہے، بلکہ اس کا ایک دروازہ بھی ہے، چنانچہ اِس آیۂ حکمت آگین میں انفرادی جماعتخانوں کی رُوحانی ترقّی کا ذکر فرمایا گیا ہے، یعنی اللہ پاک نے پیغمبر اور امام علیہما السّلام کو حکم دیا کہ وہ اپنی قوم کے حدُودِ دین کے لئے شہرِ رُوحانیت میں گھر بنائیں، اور ان گھروں کو خانۂ خُدا کا درجہ دے کر دعوتِ حق کا کام کریں، اور ایسے عرُوج وارتقاء سے مومنین کو عملاً خوشخبری دیدیں۔

۱۱۔ سورۂ توبہ (۹/۱۸) میں ارشاد فرمایا گیا ہے: خُدا کی مسجدوں کو بس صرف وہی شخص (جاکر) آباد کر سکتا ہے جو خُدا اور آخرت کے دن پر ایمان لائے اور نماز پڑھا کرے اور زکوٰۃ دیتا رہے اور خُدا کے سوا (اور) کسی سے نہ ڈرے تو عنقریب یہی لوگ ہدایت یافتہ لوگوں سے ہو جائیں گے (۹/۱۸) اگر کہا جائے کہ یہاں "مَسَاجِدَ اللّٰہِ" سے دُنیا بھر کے جماعت خانے یا مسجدیں مُراد ہیں، تو پھر ایک ہی شخص اُن سب کی آبادی میں کس طرح حِصّہ لے سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ بات ناممکن ہے، چُنانچہ یہ ارشاد تاویلی حکمت کا متقاضی ہے، اور وہ حکمت یہ ہے کہ خُدا کی مسجدیں یعنی جماعت خانے تین درجوں میں ہیں، جیسا کہ ۹ میں بتایا گیا ہے، عالمی جماعتخانہ (یعنی امام وقتؑ) مقامی جماعت خانہ، اور قلبی جماعت خانہ، اور ان تینوں کو ایک ساتھ صرف وہی شخص اپنی حاضری سے آباد کر سکتا ہے، جو خدا اور یومِ آخر (امامؑ) پر ایمان لائے اور نماز قائم کرے، یعنی کارِ دعوت کو انجام دے، اور ظاہری و باطنی زکاۃ

دیتا رہے۔

جب بندۂ مومن عقیدت و محبّت سے متعلقہ جماعت خانے میں جا کر اللہ تعالیٰ کی بندگی کرتا ہے، تو اس پُرحکمت عمل سے نہ صرف جماعتخانہ آباد ہو جاتا ہے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انفرادی اور عالمی جماعت خانہ بھی معمور ہو جاتا ہے، کیونکہ خُدا تعالیٰ کے یہ تینوں گھر مربوط اور یکجا ہیں، جبکہ مومن جماعت خانے سے وابستہ ہے، اور جبکہ امامِ زمان صلوات اللہ علیہ جماعت خانے کی رُوح ہیں، اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جو مومن جماعت خانے پر یقینِ کامل رکھتا ہے اس کی رُوح کے ذرّات میں سے ایک خاص ذرّہ ہمیشہ امامِ برحق ع کی مبارک و مُقدّس شخصیّت کی خدمت میں رہتا ہے، آپ حقیقتِ رُوح کے بارے میں تحقیق کر سکتے ہیں، اور ذرّاتِ رُوح سے متعلّق مضامین کا مُطالعہ بھی کر سکتے ہیں، تاکہ رُوح کے بسیط و ہمہ جا ہونے کا حال معلوم ہو سکے۔

۱۲۔ فرمایا گیا ہے کہ: "مومن کا قلب (دل) اللہ تعالیٰ کا عرش ہے" لیکن یہاں پُوچھنے اور جاننے کی ضرورت ہے کہ اس قول کی اصل حقیقت کیا ہے؟ کیونکہ لفظِ "مؤمن" کا اطلاق تو بہت سے لوگوں پر ہوتا ہے، مگر عرش کا تصوّر بہت بلند ہے، لہٰذا آپ اِس حکمت کو بخوبی دلنشین کر لیں، کہ مومن کا قلب امامِ زمان صلوات اللہ علیہ ہیں، اور اسی مقدّس ہستی میں خدا کا نُور جلوہ گر ہے، جیسے قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ (۸:۲۴) اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ

آڑ بن جایا کرتا ہے آدمی اور اس کے قلب کے درمیان۔ یعنی حقیقی علم کی روشنی میں تم اس قانونِ امتحان کو جان لو کہ آدمی اس کے دل (یعنی امامِ زمانؑ) کے درمیان خدا کیوں حائل ہو جاتا ہے؟ یقیناً اس میں حکیمانہ اشارہ اور کامیابی کا راز بس یہی ہے کہ ہر شخص اپنے حقیقی دِل کے ساتھ اللہ سے رجوع کرے، وہ لوٹ کر اُس طرف سے آگے بڑھے جس طرف اس کا دِل ہے، اس سے ظاہر ہُوا کہ درحقیقت قلبی جماعتخانہ بھی امامِ زمان ہیں۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْٓ اِلَّا بِاللّٰہ۔

نصیر الدین نصیر ہونزائی

۲۰۔ دسمبر ۱۹۸۴ء

تاویلی سوالات

سورۂ مائدہ (۵) کا چوتھا رکوع (یعنی ۲۰-۲۶ؔ) پیشِ نظر رہے، اور اِس سلسلے میں یہاں چند تاویلی سوالات اور جوابات درج کئے گئے ہیں، مُلاحظہ فرمائیں :-

سوال (۱): جَعَلَ فیکم انبیآء (اللہ تعالیٰ نے تُم میں بہت سے پیغمبر بنائے) کی تاویلی وضاحت کس طرح ہوسکتی ہے، کیونکہ "فیکم" کے معنی "تمھاری قوم میں" تک محدُود نہیں، بلکہ اس کا مطلب "تمھاری ذات میں" بھی ہے؟

جواب: کوئی شک نہیں کہ بنی اسرائیل میں بہت سے انبیاءؑ علیھم السّلام ہوُتے تھے، اور یہ بات عالمِ ظاہر سے متعلق ہے، لیکن جہاں تک عالمِ شخصی کا تعلّق ہے، تو اس میں جُملہ پیغمبروں کی نمائندگی نفسِ واحدؔ کرتا ہے، چُنانچہ فیکم کے معنی مطلق ہیں (یعنی محدُود نہیں)، لہٰذا اِس پُرحکمت آسمانی تعلیم میں بنی اسرائیل سے یہ فرمایا گیا تھا، کہ وہ بذریعۂ عِلم وعمل حدِّ قوّت سے حدِّ فعل میں ترقّی کرکے دیکھیں کہ ربِّ کریم کی

طرف سے انھیں کیسی کیسی عظیم نعمتیں عطا کی گئی ہیں، کہ ان کے باطن میں ایک ایسا عالم پوشیدہ ہے، جس میں ماضی اور مستقبل اپنی اپنی جگہ سے ہٹ کر حال کے طور پر سامنے آتے ہیں، یہاں یہ اصُول خوُب یاد رہے کہ قرآن حکیم میں جہاں جہاں "فیکم" ہے، اس میں یہی حکمت پوشیدہ ہے۔

سوال (۲) : آیا زمانۂ ماضی میں نبوّت کے علاوہ دُنیوی قسم کی بادشاہت بھی مسُلّمہ ہوتی تھی ؟ اگر نہیں تو یہ قرآنی ارشاد کیوُں ہے کہ خُداوند تعالیٰ نے حضرت موُسیٰ علیہ السّلام کے لوگوں کو ملوک (بادشاہ $\frac{5}{20}$) بنایا تھا؟

جواب : خُدا کے نزدیک نبوّت اور امامت کے سوا کوئی حقیقی بادشاہت نہیں، اور جس طرح بنی اسرائیل کے مُلوک (بادشاہ) ہونے کا ذکر ہے اس کی دو تاویلیں ہیں، اوّل یہ کہ ان کی قوم سے ایک شخص کا بادشاہ (امامؑ) ہونا گویا اُن کا بادشاہ ہونا تھا، دُوم یہ کہ وہ اپنے اماموں کے وسیلے سے بحدِّ قوّت بادشاہ تھے، جبکہ حضراتِ أئمہ بحدِ فعل دینی بادشاہ ہُوا کرتے ہیں، جس طرح درخت بحدِ فعل درخت ہوتا ہے، مگر اس کا تخم بحدِ قوّت درخت ہوتا ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا ہے : سو ہم نے ابراہیمؑ کے خاندان کو کتاب بھی دی ہے اور حکمت بھی دی ہے اور ہم نے ان کو بڑی بھاری سلطنت بھی دی ہے ($\frac{4}{54}$) اس حُکم میں پہلے نبوّت کا ذکر ہے، اس کے بعد امامت کا۔

سوال (۳) : ظاہر ہے کہ مذکورۂ بالا حُکم صرف اور صرف خاندانِ

ابراہیم علیہ السّلام کے لئے خاص ہے، اور اس میں کسی اور شخص کی شرکت نہ تو حدِّ فعل میں ہوسکتی ہے اور نہ حدِّ قوّت میں، پھر دُوسرے لوگوں کا وسیلۂ نجات کیا ہے؟

جواب: جو لوگ انبیاء و ائمہّ علیہم السّلام کی حقیقت پیروی کرتے ہیں، وہ اُن حضرات کی روحانی ذُرّیّت (اولاد) قرار پاتے ہیں جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کی زبان سے فرمایا گیا ہے: فَمَن تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي (۱۴/۳۶) پس جو کوئی میری پیروی کرے تو وہ مجھ سے ہے۔ جس طرح حضرت نوح علیہ السّلام کا ایک بیٹا نافرمانی کی وجہ سے پیغمبر کا فرزند نہ ہوسکا، اور جس طرح اس کے برعکس تابعداری کے سبب سے سلمان فارسی اہلِ بیتِ رسولؐ سے جا ملا، ان روشن مثالوں سے دین کا یہ قانون ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس میں یہ ممکن ہے کوئی شخص یا اشخاص بسببِ نافرمانی نبوّت و امامت کے خاندان سے خارج ہو جائیں، اور دوسری جانب یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی فرد یا افراد اطاعت و فرمانبرداری کی بدولت پیغمبر اور امام کے روحانی فرزند قرار پائیں۔

سوال (۴): آیۂ کریمہ کا ترجمہ ہے: اور تم کو وہ چیزیں دیں جو دُنیا جہان والوں میں سے کسی کو نہیں دیں (۵/۲۰)، کیا اس قرآنی تعلیم کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ بنی اسرائیل کو عطا ہُوا تھا، وہ اوّلین و آخرین میں سے کسی کو نہیں دیا گیا تھا؟ اگر حقیقت یُوں ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا یہ اختصاص صرف حضرت مُوسیٰؑ کی قوم کے لئے کیوں ہے؟

جواب: آیۂ مُقدّسہ کی حکمت یہ بتاتی ہے کہ بنی اسرائیل کے اِس

تذکرے میں اُن تمام لوگوں کی مثال دی گئی ہے، جن کو اپنے اپنے دَور میں انبیاء و اولیاء (ائمہؑ) کی ظاہری نزدیکی حاصل تھی، مگر ہر زمانے میں رحمتِ خُداوندی کو فعلاً حاصل کرنے کے لئے عِلم وعمل ضروری ہوتا ہے، پس بنی اسرائیل کو اوّلین و آخرین پر نہیں بلکہ اہلِ زمانہ پر فضیلت دی گئی تھی، اور وہ بھی بحقیقت فرمانبردار ہونے کی صُورت میں، جیساکہ آپ قرآنِ حکیم میں دیکھتے ہیں۔

سوال (۵): آیۂ کریمہ (۵/۲۱) کے مطابق "ارضِ مُقدّسہ" کی تاویل کیا ہے؟ جب اللہ تعالیٰ نے یہ پاک زمین بنی اسرائیل کے نام پر لکھ دیا تھا، تو پھر وہ لوگ اس میں کیوں داخل نہیں ہوسکتے تھے؟

جواب: ارضِ مُقدّسہ کی تاویل رُوحانیّت اور عالمِ شخصی ہے، جس کو خدا تعالیٰ نے ہر مسلم اور مومن کے نام لِکھ دیا ہے، لیکن ہر رحمت و نعمت پہلے تو حدِّ قوّت میں ہُوا کرتی ہے، جس کو حدِّ فعل میں لانے کے لئے عِلم وعمل کی سخت ضرورت ہوتی ہے، اگر یہ نہ ہُوا تو کوئی رحمت اور کوئی نعمت اپنے آپ حدِّ قوّت سے حدِّ فعل میں نہیں آسکتی ہے، جس کی ایک مثال گندم کے بیج ہیں، جو بحدِّ قوّت کسی زمیندار کے سال بھر کا غلّہ اور سرمایہ ہیں، اب آپ خُود بتایئے کہ کھیت میں بیج بکھیرنا، ہل چلانا، وغیرہ زمیندار کا کام ہے یا خُدا کا؟ تاکہ یہ بیج حدِّ قوّت سے حدِّ فعل میں آکر گندم کا ایک بڑا ذخیرہ بن سکیں، ظاہر بات ہے کہ اللہ تعالیٰ جو صاحبِ حکمت ہے صرف اپنا کام کرتا ہے وہ ظاہری اور جسمانی کام نہیں کرتا، اُس نے اپنی قدرتِ کاملہ سے انسان کو بے شمار عقلی، روحی

اور جسمی عمل کی صلاحیتوں سے نوازا ہے، پس علم و عمل میں انسان کی سعادت پوشیدہ ہے۔

سوال (۶) : قرآنِ حکیم کی کئی آیات میں خاسرین یعنی زیانکاروں کا بھی ذکر ہے، اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ لوگ اچھے اچھے کام انجام دیں، اور اللہ تعالیٰ ان کو کوئی اجر و صلہ نہ دے، پھر وہ لوگ زیانکار کہلائیں؟

جواب : اگر کسی اِنسان کا قول و فعل خُدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی خوشنودی کے مطابق ہے تو وہ مقبول و مفید ہوتا ہے، ورنہ وہ ضائع ہو جاتا ہے، اور خُدا کی سُنّت ہمیشہ سے یہی چلی آئی ہے، اس کا مطلب یہ ہُوا کہ دین کی ہر بات اور ہر کام نورِ ہدایت کی روشنی میں ہونا چاہیئے، تاکہ موجبِ ثواب ہو، کیونکہ نورِ ہدایت کے ہمیشہ کے لئے موجود و حاضر رہنے کے یہی معنی ہوتے ہیں۔

سوال (۷) اگر ارضِ مُقدّسہ سے رُوحانیّت اور عالمِ شخصی مُراد ہے، تو اس میں وہ زبردست لوگ کون تھے، جن کے خوف سے بنی اسرائیل اُس پاک سرزمین یا اُس پاک عالم میں داخل نہیں ہو سکتے تھے؟

جواب : اُن سرکش لوگوں کی تاویل، جو پاک و پاکیزہ زمین پر قابض تھے، ظاہری طاغوتی قوّتیں ہیں، جو نفسِ امّارہ کے توسّط سے اِنسان کے باطن میں کام کرتی ہیں، جن کی موجُودگی میں کمزور مومن عالم

شخصی میں داخل نہیں ہو سکتا ہے، اور آیۂ کریمہ میں اِسی مطلب کی ترجمانی کی گئی ہے (۵/۲۲)

سوال (۸) : وہ دو مرد کون تھے؟ جنھوں نے اپنی قوم کو باطنی جہاد کے لئے حوصلہ دیا؟ اور وہ دروازہ کیا تھا، جس سے لوگوں کو رُوحانیّت میں داخل ہو جانا چاہیئے؟

جواب : وہ دو مرد جو خوفِ خُدا رکھتے تھے، اور جن پر اللہ کا فضل و احسان تھا، وہ اساس اور امام علیہما السّلام تھے، اور وہ دروازہ جس سے شہرِ رُوحانیّت میں داخل ہو جانا چاہیئے، بابِ امامت (حُجّتِ اعظم) تھا، کیونکہ اللہ جَلّ شانہٗ، کا باب (دروازہ) ناطقؑ ہُوا کرتا ہے، ناطق کا باب اساس، اساس کا باب امام، اور امام کا باب حُجّتِ اعظم ہوتا ہے، جس سے امامِ برحق کا وہ فرزند مُراد ہے، جو وقت آنے پر مرتبۂ امامت پر فائز ہو جاتا ہے۔

سوال (۹) خدا، رسولؐ، اور امام کے دروازے کیوں ہیں؟ اور ان کی خصُوصیّت کیا ہے؟ کیا اس تصوّر کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص خُدا تک پہنچ جائے؟

جواب : دیکھئے کہ خُدا تعالیٰ مکان و لامکان سے برتر بھی ہے، وہ ہر جگہ بھی ہے، اور اس کا ایک مقرّر گھر بھی ہے، چُنانچہ اوّل الذکر دونوں تصوّر ایسے نہیں کہ کوئی بندہ اُن سے خُدا تک رسائی کر سکے، لہٰذا ضروری ہے کہ خانۂ خُدا سے رجُوع کیا جائے، اور خانۂ خُدا دروازے

کے بغیر نہیں ہو سکتا، جیسے پیغمبرِ اکرمؐ نے ارشاد فرمایا کہ: میں حکمت کا گھر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ مراتبِ عالیہ کے دروازے منارۂ ہدایت کے طور پر ہیں، اور ان کی خاصیّت علم و حکمت ہے، پس اس تصوّر کے بغیر خدا شناسی ممکن نہیں، یعنی خدا کا دروازہ پیغمبرؐ اور پیغمبرؐ کا دروازہ امام ہے اور راہِ ہدایت کا قانون یہی ہے۔

سوال (۱۰): اس ارشادِ خداوندی میں کیا حکمت ہے، جو فرمایا گیا ہے: "پس جب تم دروازے سے داخل ہو جاؤ گے تو اسی وقت غالب آؤ گے؟

جواب: حُجّتِ اعظم جو امامِ اقدس و اطہر علیہ السّلام کا رُوحانی دروازہ ہے، اس کے وسیلے سے امامِ عالیمقامؑ کی رُوحانیّت میں داخل ہو جانے کے نتیجے میں بندۂ مومن کا شخصی عالم فتح ہو جاتا ہے، اور تمام طاغوتی طاقتیں مغلوب ہو جاتی ہیں۔

سوال (۱۱) اس پاک آیت میں جس طرح توکّل کا ذِکر رُوحانی فتح کے بعد آیا ہے، اس میں کیا حکمت ہے؟

جواب: چونکہ توکّل ایمان کے درجۂ کمال پر ہے، لہٰذا اس کا ذِکر اسی طرح آخر میں آیا ہے، یعنی مومن جب اپنے عالمِ شخصی میں داخل ہو جاتا ہے تو تب حقیقی وکیل کارسازی کرتا ہے۔

نصیرالدین نصیر ہونزائی

۱۸- اکتوبر ۱۹۸۴ء

سلمانِ فارسی

ا۔ لفظِ سلمان کا مادّہ س، ل، م ہے، چنانچہ اس کے خاص مفہومات یہ ہیں: سلامتی والا، ناجی، تسلیم و تفویض کرنے والا، یعنی اپنی انا کو خدا کے سپرد کر دینے والا، صلح جُو، امن پسند، اطاعت گزار، فرمانبردار، وغیرہ، چونکہ حرفی لحاظ سے "سلمان" کا اسمِ مُصَغّر یا تصغیر (DIMINUTIVE) سلیمان ہے، لہٰذا یہ کہنا ایک حقیقت ہے کہ اِس خوبصورت اور پیارے نام کی قرآنی بہشت، یعنی حکمتوں کی جنّت وہ قصّۂ قرآن ہے، جو حضرت سلیمان علیہ السّلام سے متعلّق ہے، کیونکہ یہ عزیز نام (یعنی سلمان الخیر) آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے رکھا تھا، جبکہ سلمانِ فارسی کا سابق نام روزبہ یا مابہ تھا، اور اِس بات میں کسی مسلمان کو کوئی شک نہیں کہ حضورِ انورؐ کا فرمایا ہوا ہر لفظ ایک طرح کی آسمانی وحی کا درجہ رکھتا ہے (۵۳-۴)، اِس وجہ سے یہ نام بابرکت اور پُرحکمت ہو گیا، اگرچہ یہ نام پہلے ہی سے لوگوں میں رائج تھا، لیکن جس وقت اِس کا تسمیہ (نام رکھنا) نورِ نبوّت کی روشنی میں کیا گیا، تو اس کے مرادی معنی لُغوی مناسبت کے

ساتھ ساتھ کچھ اور ہو گئے، وہ یہ کہ سلمان کے نام میں حضرت سُلیمان کی رُوحانی سلطنت کا تصوّر آگیا۔

۲۔ آپ نے شاید "حکمتِ تسمیہ" کے مضمون کو غور سے پڑھا ہوگا، کہ تسمیہ میں کوئی تصوّر، کوئی حکمت اور کوئی فلسفہ ہُوا کرتا ہے، یا بالفاظِ دیگر نام رکھنے کے پس منظر میں کسی اُمیّد کا ذکر ہوتا ہے یا کوئی سعادت و بہتری مطلوب ہوتی ہے، اور اگر یہ کام ہادئ برحق کا ہے تو یقیناً اِس میں اعلیٰ درجے کی حکمتیں پوشیدہ ہوتی ہیں، چنانچہ رسُولِ پاک صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے جو پسندیدہ نام اپنے عاشقِ صادق کو دیا ہے اِس میں دینی کامیابی، طلوعِ نوُر، دیدارِ اقدس اور رُوحانی سلطنت کی بشارت کیوں نہ ہو۔

۳۔ سلمانِ فارسی ارادۂ الٰہی کے مطابق نوُرِ نبوّت اور نوُرِ امامت کی ایک خصوصی پیداوار تھے، لہٰذا ان کی تاریخ میں جذبۂ دینداری اور اہلِ بیتِ اطہارؑ سے والہانہ محبّت کی درخشاں مثال موجود ہے، ہمیں نظامِ ہدایت کے باطنی پہلو کے بارے میں بھی سوچنا چاہیئے کہ کس طرح سلمانِ فارسی کے دِل میں تلاشِ حقیقت کا طوفانی شوق اُبھرا؟ وہ کون سی ہستی تھی جس نے شہرِ اصفہان کے ایک مجوسی (آتش پرست) فرزند کے دِل و جان میں ایسی آتشِ عشق جلائی؟ یقیناً کوئی ایسا ہمہ گیر وسیلہ تھا، جس کو نوُرِ ہدایت کہنا چاہیئے۔

۴۔ کتاب "بخاری" حصّہء اوّل کے شرُوع میں حدیثِ نبوی ہے:

وَاَحْیَانًا یَّتَمَثَّلُ لِیَ الْمَلَکُ رَجُلًا"۔ اور کبھی فرشتہ آدمی کی صُورت میں میرے پاس آتا ہے (اور مجھ سے کلام کرتا ہے) اس ارشاد میں آپ دیکھتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے پاس بعض دفعہ جبرائیلؑ ایک مرد کی شکل میں وحی لے کر آیا کرتا تھا، لیکن عقل پُوچھتی ہے کہ فرشتہ کس مرد کی صورت میں آتا تھا؟ اس کے جواب میں قانُونِ رُوحانیّت کہتا ہے کہ ویسے تو عظیم فرشتہ جُملہ مومنین کا آئینۂ رُوح ہُوا کرتا ہے، اِس لئے اس کا ظہور ایک مشترکہ صورت میں ہوتا ہے، تاکہ وحدتِ ارواح کی حقیقت ظاہر ہو جائے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جبرائیلؑ رسُول کریمؐ کے پاس سلمان فارسی کی رُوحانی شکل میں آیا کرتا تھا، اور بعض کہتے ہیں کہ یہ ظہور بدحیۂ کلبی کی صُورت میں ہوتا تھا۔ میں عرض کرتا ہوں کہ اس میں کوئی تضاد نہیں، جبکہ رُوح القدس میں سب ہیں،

۵ سُنن ابنِ ماجہ، جلدِ اوّل، باب ۴۲، حدیث ۱۵۵ میں ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰہَ اَمَرَنِیْ بِحُبِّ اَرْبَعَۃٍ وَاَخْبَرَنِیْ اَنَّہٗ یُحِبُّہُمْ قِیْلَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ مَنْ ھُمْ؟ قَالَ عَلِیٌّ مِنْھُم یَقُوْلُ ذَالِکَ ثَلَاثًا وَّ اَبُوْذَرٍّ وَسَلْمَانُ وَالْمِقْدَادُ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے ارشاد فرمایا: اللہ نے مجھے چار شخصوں سے محبّت کرنے کا حُکم دیا، اور یہ خبر دی ہے کہ وہ بھی ان سے محبّت رکھتا ہے، صحابہ نے عرض کیا: یارسُول اللہ وہ کون ہیں؟ آپ نے فرمایا: علی بھی ان میں سے

ہے، اور یہ بات آپؐ نے تین بار فرمائی، اور ابوذر، سلمان، اور مقداد ہیں۔

۶۔ یہ جاننا ضروری ہے کہ ایک تو ہوتا ہے خُدا کا عام طور پر سب مومنوں سے محبّت کرنا، اور دُوسرا ہوتا ہے اس کا خاص طور پر چند سے محبّت کرنا، چُنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ مذکورہ حدیث میں صرف چار ہستیوں سے اللہ تعالیٰ کی محبّت کا ذکر ہے، اِس سے ظاہر ہُوا کہ یہ خصوصی محبّت کی بات ہے، جس میں مولا علی صلوات اللہ علیہ کی شانِ ولایت تابان و درخشان ہے، اَب آپ کو اِس ارشادِ نبوی کی روشنی میں متعلّقہ آیاتِ قرآنی کا بغور مطالعہ کرکے یہ دیکھنا ہے کہ خُدا تعالیٰ کن لوگوں سے محبّت و دوستی کرتا ہے، آپ قرآن میں دیکھیں گے کہ پروردگارِ عالم ان حضرات سے محبّت کرتا ہے جو بحقیقت متّقی ہیں (۳/۷۶) ان مومنین سے دوستی کرتا ہے جو اس کے رسُولؐ کے فرمان بردار ہیں (۳/۳۱) ان بندوں کو چاہتا ہے جو نیکوکار ہیں (۳/۱۳۴) خُدا ان لوگوں کا دوست ہے جو عالی ہمّت اور صابر ہُوا کرتے (۳/۱۴۶) خدا و رسولؐ ان اشخاص سے محبّت کرتے ہیں، جو مقامِ توکّل پر ہیں (۳/۱۵۹) جو عادل ہیں (۵/۴۲) اور جو پاک و صاف ہُوا کرتے ہیں (۹/۱۰۸)

۷۔ غزوۂ احزاب (غزوۂ خندق) میں سلمان فارسی کے بارے میں رسُولِ اکرمؐ نے ارشاد فرمایا: سلمان منّا اهل البیت۔ سلمان ہم اہلِ بیت میں سے ہے۔ یہاں ہمیں کس طرح سوچنا چاہیئے؟ کیا ایسے خاص موقع پر آقا اور غلام ایک دوسرے کے انتہائی قریب نظر نہیں آتے ہیں؟ آیا اِس پُرحکمت حدیث کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے

ہیں کہ سلمانِ فارسی جیتے جی نفوس میں فنا ہو گئے تھے؟ وہ اپنی پاک و پاکیزہ رُوح کو (اُس کیفیّت میں جس میں کہ نہ مکان ہے نہ زمان) ازلی و ابدی طور پر اصل سے واصل دیکھتے تھے، اور یہ سب کچھ اس وجہ سے حاصل ہُوا تھا کہ آپ کے دِل میں ہمیشہ پیغمبرؐ اور امامؑ کا دریائے عشق موجزن رہتا تھا، آپ اپنے باطن میں ایک روشن دُنیا تھے، آپ کے سینے میں علم و عرفان کے بیش بہا خزائن پوشیدہ تھے۔

۸۔ اِس حدیثِ شریف میں، جو سلمانِ فارسی سے متعلّق ارشاد ہے، یہ واضح اور قابلِ فہم مثال موجُود ہے کہ اگر مومنین چاہیں تو عالی ہمتّی، سخت محنت، جان فشانی، جذبۂ قربانی، اور حقیقی محبّت سے کام لے کر نُور سے اپنا رشتہ جوڑ سکتے ہیں، یعنی وہ چشمِ باطن سے یہ دیکھ سکتے ہیں، کہ کس طرح ان کی انائے عُلوی ازلی طور پر اصل سے واصل و وابستہ رہی ہے، یہ کام اگرچہ مشکل ہے لیکن ناممکن ہرگز نہیں، جیسے قرآن حکیم کا ارشاد ہے، جس میں اِسی قانونِ دین سے متعلّق حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی ترجمانی کی گئی ہے۔ فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّہٗ مِنِّیْ (۱۴/۳۶) پس جو کوئی میری پیروی کرے وہ مجھ سے ہے۔ یعنی جو شخص اُس راہ پر گامزن ہوتا جائے، جس پر میں چلا ہوں، تو ایک دن اس کو یہ بھید حقیقت معلوم ہو جائے گا کہ کس طرح وہ میرا روحانی اور نورانی فرزند ہے، پس یہ ایک حقیقت ہے کہ جو شخص چاہے تو سلمان کی طرح اپنا ازلی رشتہ نور کے ساتھ جوڑ سکتا ہے، اور جو اس کے برعکس چاہے وہ کنعان دلبر

نوحؑ کی طرح اس رشتے کو توڑ سکتا ہے۔

۹۔ سوال: آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے سلمان فارسی کو کس معنیٰ میں اہلِ بیت اطہار کے ایک فرد کا درجہ دیا؟ اس میں "بیت" سے کون سا گھر مُراد ہے؟ آیا آیۂ تطہیر میں پنجتن پاک کے ساتھ سلمان فارسی کا بھی ذکر موجُود ہے؟ کیا اس آیۂ مبارکہ میں جُملہ آنے والے ائمّۂ ہُدا صلوات اللہ علیھم کا ذِکر موجُود ہے؟

جواب: پیغمبر خداؐ نے سلمان کو جس طرح اہلِ بیتِ پاک میں شامل کرلیا، اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ سلمان فارسی بوسیلۂ اطاعت و فرمانبرداری خانۂ نورانیت میں داخل ہوکر پنجتن کے ہمنشین ہوگئے تھے، یہاں بیت سے خانۂ نور و نورانیت مُراد ہے۔ جی ہاں آیۂ تطہیر میں سلمان کا بھی ذکر ہے، ہر چند کہ ظاہراً عملِ کِساء سے ایسا نہیں لگتا ہے، کیونکہ وہ کام محض ایک علامت کے طور پر تھا، اور اُن حضرات کی تطہیر در اصل جُدا جُدا وقتوں میں فرداً فرداً ہُوئی تھی۔ جی ہاں، آیۂ تطہیر میں تمام پاک اماموں کا ذکر موجود ہے، کیونکہ بعد کا ہر امام بھی اسی خانۂ نوُر میں رہتا ہے، جس میں پنجتنِ پاک رہتے تھے لہٰذا ہر امام پر اہلِ بیت کا اطلاق ہو جاتا ہے۔

۱۰۔ اگر دُنیا کا کوئی بادشاہ کسی غریب سے دوستی کرنے لگتا ہے تو پھر وہ شخص غریب نہیں رہتا، رفتہ رفتہ امیر بن جاتا ہے، چُنانچہ جب یہ حقیقت ہے کہ خدا اور رسولؐ سلمان سے محبّت کرتے تھے، اور ان

کا نام حضرت سلیمانؑ کے نام مبارک پر رکھا گیا تھا، تو پھر اس کے معنی یہ ہوتے کہ اللہ اور اس کے پیغمبرؐ سلمان کو عالمِ شخصی میں سلیمان بنانا چاہتے تھے اور خُدا تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے (۲۲/۱۴)

۱۱۔ خُدائے حکیم نے رُوحِ نباتی کی وجہ سے نباتات کو جمادات پر فوقیّت دی ہے، رُوحِ حیوانی کے سبب سے جانوروں کو نباتات پر رفعت دی ہے، رُوحِ ناطقہ کی بدولت انسانوں کو حیوانات کا بادشاہ بنا دیا، رُوح الایمان کے وسیلے سے مومنین کو لوگوں پر برتری دی، اور رُوحِ قدسی یا نُور کے ذریعے سے حضراتِ انبیاء و ائمّہ علیہم السّلام کو مومنین پر فضیلت بخشی ہے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے: اور ہم نے داؤدؑ اور سلیمانؑ کو (رُوحانی) عِلم عطا فرمایا اور ان دونوں نے کہا کہ تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے ہم کو اپنے بہت سے ایمان والے بندوں پر فضیلت دی (۲۷/۱۵)

اس ربانی تعلیم میں، جو حکمت سے مملو ہے، آپ دیکھ سکتے ہیں کہ مومنین پیغمبروں اور اماموں کے انتہائی قریب ہیں، اس معنیٰ میں کہ انبیا و ائمّہ اُن سے افضل ہیں، جبکہ اہلِ ایمان دُنیا والوں سے افضل ہیں، جس طرح بنی اسرائیل سے اس کی مثال ملتی ہے (۲/۴۷، ۲/۱۲۲) کہ وہ اپنے وقت کے مومنین ہونے کی وجہ سے اہلِ جہان پر فضیلت رکھتے تھے۔

۱۲۔ سوال: جب حضرت سلیمانؑ حضرت داؤدؑ کے قائمقام (جانشین) ہوگئے، تو اُنھوں نے دعوتِ حق کا اعلان اِس طرح کیا: اے لوگو ہم کو پرندوں کی بولی کی تعلیم کی گئی ہے اور ہم کو ہر چیز سے دی

گئی ہے (۲۷/۱۶) اس میں پوچھنا یہ ہے کہ آپؑ نے دینی دعوت میں اپنی سلطنت کو کیوں موضوع بنایا؟ لوگوں کو اس سے کیا تعلّق تھا؟ آیا پرندوں کی بولی کی کوئی تاویل ہے؟ انھوں نے "مجھ کو" کی جگہ "ہم کو" کیوں کہا؟ ہر چیز کا مطلب کُلّ کائنات ہے، سو کُلّ کائنات سے ان کو کیا دیا گیا تھا:

جواب: حضرت سلیمان علیہ السّلام نے دعوت کا جو طریقہ اختیار کیا وہ منشائے الٰہی کے عین مطابق تھا، آپؑ تمام انبیا و ائمہؑ علیہم السّلام اور مومنین کی رُوحانی بادشاہی کی جیتی جاگتی تصویر تھے، لہٰذا یہ امر بہت ہی ضروری تھا کہ لوگوں کو مملکتِ بہشت کا ذکر کر دیا جائے، جس سے لوگوں کا تعلّق ہے، پرندوں سے ارواحِ خلائق مُراد ہیں، جن سے بہشتِ رُوحانیّت میں گفتگو ہوتی ہے، اس کے علاوہ اس میں ظاہری پرندے بھی ہیں، اور "مجھ کو" کی جگہ "ہم کو" کہنے کی وجہ یہ ہے کہ آپؑ اِس رُوحانی سلطنت کے بیان میں تمام کامل اِنسانوں کی طرف سے نمائندگی کر رہے تھے، دُوسری وجہ یہ بھی ہے کہ آپؑ کے ساتھ حدُودِ دین تھے، اور ہر چیز سے یا کُلّ کائنات سے جو کچھ اُن کو دیا گیا تھا، وہ عالمِ شخصی تھا، جو کُلّ عالم کی ایک زندہ تصویر کی حیثیت سے ہوتا ہے۔

۱۳۔ حضرت سلیمان علیہ السّلام کے قصّۂ قرآن میں جہاں تمام حکمتوں کا مرکز ہے، اور جس سے یہ حکمتیں پھیل کر متعلّقہ قصّے کو مکمّل کر دیتی ہیں، وہ مرکز یہ ہے: وَاُوْتِينَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ (اور ہم کو ہر چیز سے دی گئی ہے) اور باقی جو کچھ ہے وہ اسی کی وضاحت

ہے، چنانچہ کُلّ شَیْءٍ کے معنی ہیں تمام عقلی، رُوحی، اور جسمی چیزوں کا مجموعہ یعنی پوری کائنات جس کی عقل، جان، اور جسم ہے، اور مِن کُلِّ شَیْءٍ کا مطلب ہے اس کائنات کی ایک لطیف زندہ تصویر، یعنی عالمِ شخصی، جس میں سب کچھ ہے، اور یہ حقیقت وہی ہے جو سورۂ یاسین (۳۶/۱۲) میں امامِ مُبین کے بارے میں مذکور ہے، مطلب یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ امام تھے، لہٰذا ان کی ذات میں کائنات و موجُودات کی لطیف صُورت سے عالمِ شخصی بنایا گیا تھا۔

۱۴۔ سوال: وَحُشِرَ لِسُلَیْمٰنَ ..... فَھُمْ یُوْزَعُوْن

(۲۷/۱۷) اور سلیمان کے لئے ان کے لشکر جمع کئے گئے تھے، جو جنات اور انسانوں اور پرندوں میں سے تھے اور وہ مکمّل ضبط میں لاتے جاتے تھے۔ آپ اکثر کہتے ہیں کہ قرآنی الفاظ کے آپس میں معنوی ربط و رشتہ ہُوا کرتا ہے، تو بتایئے کہ اِس آیۂ مقدّسہ میں جس طرح لفظ "حشر" آیا ہے، اور جیسے قرآن پاک کے بہت سے مقامات پر قیامت کا ایک نام 'حشر' ہے ان دونوں کے درمیان کیا مناسبت ہے؟ سلیمان علیہ السّلام کے یہ لشکر کہاں سے سے جمع کئے گئے؟ یوزعون کے کیا معنی ہوتے ہیں؟

جواب: اِن دونوں لفظوں کے درمیان انتہائی ربط و رشتہ یہ ہے کہ یہ لفظاً و معناً ایک ہی ہے، کیونکہ یہ حضرت سلیمانؑ کی ذاتی قیامت کا واقعہ ہے، جس میں رُوحانی طور پر آپؑ کے لشکر بصورتِ ذرّات جمع ہو گئے، یہ ذرّات خلائق میں پوشیدہ تھے، قرآنِ حکیم میں یہ لفظ (حشر) اپنی مختلف شکلوں میں کُل ۴۳ بار آیا ہے، اور ہر مقام پر قیامت ہی کے معنی میں

ہے، یہاں تک کہ قصۂ فرعون میں جہاں جہاں لفظ "حشر" استعمال ہوا ہے وہ بھی حضرت موسیٰؑ کی انفرادی اور شعوری قیامت کی بات ہے، جس میں ساحروں کو شکست ہوئی تھی، یوزعون میں کئی معنی جمع ہیں، جیسے منظم کرنا، ترتیب دینا، کنٹرول کرنا، وغیرہ، کیونکہ جب انسانِ کامل کی رُوحانیت میں صور بجنے لگتا ہے تو اس کی انفرادی قیامت برپا ہو جاتی ہے، اور اس کے لشکر جنوں، اور پرندوں (یعنی فرشتوں) میں سے جمع ہو کر رُوحانی جہاد کی پوزیشن لیتے ہیں، تاکہ خُدا کا دین ادیانِ عالم پر غالب ہو (۹/۳۳، ۴۸/۲۸، ۶۱/۹)

۱۵۔ سوال: یہ ہمارے نزدیک بہت ہی عجیب بات ہے کہ آپ نے رُوحانی جہاد کا تصوّر پیش کیا، کیا آپ اس سلسلے میں ہمیں کچھ مثالوں اور دلیلوں سے مزید سمجھا سکتے ہیں کہ یہ جہاد کس طرح ہے؟

جواب: قرآنِ حکیم میں جابجا باطنی اور روحانی جہاد کا ذکر موجود ہے، یہ مقدّس جنگ ظہورِ اسلام سے پہلے بھی تھی، زمانۂ نبوّت میں بھی اور اب بھی ہے، مگر یہاں یہ بات یاد رہے کہ جہاد ظاہراً و باطناً پیغمبرِ خداؐ اور امامِ برحقؑ کے ذریعے سے ہو سکتا ہے، چنانچہ قرآن پاک میں جہاں جہاں خُدائی لشکر یا آسمانی جنگ کا ذکر کیا گیا ہے، وہاں اسی رُوحانی جہاد کی نشاندہی کی گئی ہے، جیسے سورۂ فتح (۴۸/۴، ۴۸/۷) میں ارشاد ہے:

وَلِلّٰهِ جُنُودُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ اور آسمانوں اور زمین کے لشکر اللہ ہی کے ہیں۔ سماوی لشکر فرشتے ہیں، اور ارضی لشکر جنّ و انس ہیں، اور کسی بادشاہ یا حکومت کی فوج جنگی مقصد کے سوا نہیں

ہوتی، اسی طرح سورۂ صافات (۱۷۱ تا ۱۷۳) میں فرمایا گیا ہے: اور ہمارے خاص بندوں یعنی پیغمبروں کے لئے ہمارا یہ قول پہلے ہی سے مقرر ہو چکا ہے کہ بیشک وہی غالب کئے جائیں گے اور (ہر بار) ہمارا ہی لشکر غالب رہتا ہے۔ اس کے علاوہ سورۂ مائدہ (۵۶/۵) میں حزب اللہ (خدا کا گروہ) کے معنی میں لشکرِ خدا کے غالب و فاتح ہونے کا بیان ہے، اسی سورہ (۵۴/۵) میں ایک ایسی قوم کے آنے کی بشارت ہے کہ اُن سے اللہ تعالیٰ کو محبّت ہوگی اور انکو اللہ تعالےٰ سے محبّت ہوگی، وہ مومنین پہ مہربان ہوں گے اور کافروں پر سخت گیر ہوں گے وہ خُدا کی راہ میں جہاد کریں گے (۵۴/۵) اِس حکم میں آپ واضح طور پر دیکھ رہے ہیں کہ جن کے ظہورِ رُوحانی کی خوشخبری دی گئی ہے، وہ لوگ دُنیائے ظاہر کے مُسلمین و مومنین سے افضل ہیں، جبکہ وہ اہلِ ایمان پر بڑے نرم دل اور مہربان ہیں، اور جہاد کرنے والے ہیں، اِس سے ظاہر ہے کہ یہ رُوحانی لشکر ہی ہیں، جو ہر زمانے میں نورِ ہدایت کے تحت اپنا حربی عمل انجام دیتے رہتے ہیں، اِس سِلسِلے کے قرآنی حوالے بہت زیادہ ہیں، لہٰذا رُوحانی جہاد پر کوئی الگ مضمون ہونا چاہیئے۔

۱۶۔ سوال: سورۂ نساء کے ایک ارشاد (۶۹/۴) میں یقیناً درجہ وار پیغمبروں، صدّیقوں، شہیدوں، اور صالحوں کے بعد فرمانبردار مومنین کا ذِکر فرمایا گیا ہے، اس سے صاف طور پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ صالحین عام مومنین سے آگے ہیں، اُن سے شہداء آگے ہیں، شہیدوں سے صِدّیقین آگے ہیں، اُن سے انبیاء آگے ہیں، لیکن

مراتب کے اِس تعیّن کے باوجود اس کی کیا وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السّلام جسمانی زندگی کے اختتام پر صالحین یعنی نیکوکاروں میں داخل ہو جانا چاہتے تھے؟ جیسے حضرت سلیمانؑ نے اِس مقصد کے لئے دُعا کی (۲۷/۱۹) آپ قرآنِ حکیم میں دیکھیں: (۲/۱۳۰، ۱۲/۱۰۱، ۱۶/۱۲۲، ۲۶/۸۳، ۲۹/۹، ۲۹/۲۷)

جواب: بے شک آیۂ کریمہ (۴/۶۹) میں جس ترتیب سے درجاتِ جسمانی کا ذِکر فرمایا گیا ہے، وہ حقیقت ہے، کیونکہ اس میں سب سے پہلے ناطقوں (نبیّین) کا ذِکر ہے، پھر اساسوں (صِدّیقین) کا، پھر اماموں (شُہداء) کا، اور اس کے بعد ابواب (صالحین) کا ذکر ہے، اور یہاں یہ بھی یاد رہے کہ ہر ناطق کا باب اساس ہوتا ہے، ہر اساس کا باب امام ہوتا ہے، اور ہر امام کے لئے باب اس کا وہ فرزند ہوتا ہے جو تختِ امامت کا وارث ہو، سو اِس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت سلیمانؑ اور دُوسرے تمام حضراتِ انبیاء و ائمہؑ اپنے اپنے باب (صالح) میں زندہ رہنا چاہتے تھے، تاکہ صالحین یعنی نیکوکاروں کا جو سب سے آخری مقصد ہے، اِس کے حصُول کے لئے عمل کیا جائے۔

سورۂ شعراء (۲۶/۸۳-۸۴) میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے اِس طرح دُعا کی: اے میرے پروردگار مجھ کو ایک حُکم (یعنی "امرِ کُن" کی شناخت) عطا فرما اور مجھ کو صالحین (یعنی میرے اساس = باب) سے مِلا دے اور میرے لئے آئندہ آنے والوں (یعنی نُورِ نبوّت و نُورِ امامت) میں زبانِ صدق مقرّر فرما۔ اِس سے یہ حقیقت عیاں

ہوجاتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ بحکمِ خدا اپنے نُور کو باب یعنی حضرت اسماعیلؑ (جو اساس تھے) میں مُنتقل کر دینا چاہتے تھے، تاکہ نُور اسی طرح سِلسلۂ صالحین یعنی آئندہ ابواب سے وابستہ رہے۔

۱۷۔ سوال: باب کی اتنی بڑی اہمیّت کیوں ہے کہ اس کو صالح کا ٹائٹل دیا گیا ہے؟ اور کیُوں ایسا ہے کہ ہر ناطق ہر اساس اور ہر امام اپنے باب میں داخل ہوجاتا ہے؟

جواب: باب کی بہت بڑی اہمیّت اِس وجہ سے ہے کہ ناطقؑ کا سارا نوُرانی عمل اساسؑ کی ذات میں واقع ہوتا ہے، جو ناطق کے لئے باب (دروازہ) ہے، اساسؑ کا نوُر امامؑ میں کام کرتا ہے جو اساسؑ کا باب ہے اور اسی طرح امام کا نوُر بھی اپنے اُس فرزند میں کام کرتا ہے جو امام کے بابِ اقدس کا درجہ رکھتا ہے، اور بعد میں امام مقرّر ہونے والا ہے۔ ان تینوں صوُرتوں میں "نوُرِ فعال" باب کی مُبارک ذات میں ہُوا کرتا ہے، جس میں دُنیا اور اہلِ دُنیا کی صلاح و فلاح پوشیدہ ہے، لہٰذا سِلسلۂ ابواب کو صالحین کہا گیا ہے، کہ سب سے زیادہ رُوحانی حرکت باب میں پائی جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ جن معنوں میں اس وسیع و عریض کائنات کو دستِ قدُرت میں لپیٹ لیتا ہے، اِس میں بہت سے حکیمانہ اشارے ہیں، چنانچہ وہ اس میں ہر قسم کی بعید چیزوں کو قریب لاتا ہے، وہ ازل و ابد کو یکجا کر کے دکھاتا ہے، ماضی (جس کا اگلا سِرا زمانۂ آدمؑ ہے) کو لوٹا کر زمانۂ حال میں مرکوز

کر دیتا ہے، اور مستقبلِ بعید کو اجتماعی قیامت سمیت کھینچ کر انفرادی رُوحانیت میں سما دیتا ہے، اور اگر ہم مانتے ہیں کہ یہ ایک قرآنی حقیقت ہے، تو چاہئے اِسی قانُون کے مطابق یہ بھی مانیں کہ یہ سب کچھ "نُوۡرٌ عَلٰی نُور (۲۴/۳۵)" کے مقام پر واقع ہوتا ہے، یعنی روح و روحانیّت کی اس منزل میں یہاں ناطق یا اساس یا، امام اور باب دو دریاؤں کی طرح باہم مل جاتے ہیں،

(۱۸/۶۱-۶۰)

۱۸۔ سوال : قِصّۂ سلیمانؑ (۲۷/۳۴) میں ایک امکانی فساد کا بھی ذکر ہے، تو پیغمبر اور امام جیسی مُبارک ہستی کے عمل میں کیوں فساد ہونا چاہیئے؟ کیا آپ اِس بارے میں ہمیں کچھ سمجھا سکتے ہیں یا کوئی حکمت بیان کر سکتے ہیں ؟

جواب : فساد (خرابی، بگاڑ) دو قسم کا ہوتا ہے، ایک فساد برائے تخریب ہے، اور دُوسرا فساد برائے تعمیر، اگر حضرت سلیمان علیہ السّلام ظاہری جہاد کی غرض سے شہرِ سبا پر حملہ آور ہو جاتے تو یقیناً وہاں فساد اور بگاڑ ہو جاتا، لیکن ہمیں عقل کی روشنی میں اِس بات کا فیصلہ دینا ہوگا کہ ایسا کرنا جائز تھا یا نہیں؟ ملکۂ سبا کا یہ کہنا کہ "جب مُلوک (ائمہ) کسی شہر میں داخل ہو جاتے ہیں تو اس کو خراب کرتے ہیں" یہ بات ظاہراً بالکل درست ہے کہ یاجوج و ماجوج (۱۸/۹۴، ۲۱/۹۶) جو امامِ عالیمقامؑ کے لشکر میں سے ہیں، ہر مناسب قریۂ ہستی کو تعمیرِ نو کے پیشِ نظر زیر و زبر کر دیتے ہیں، لیکن اگر خُودی کے بُت کو توڑنے سے خُدا مل جاتا ہے، تو پھر اس سے بڑی سعادت

اور کیا ہو سکتی ہے۔

۱۹۔ اِس میں بہت بڑی حکمت ہے کہ قرآنِ حکیم نے کسی بھی کافر حکمران کو بادشاہ (مَلِک) نہیں کہا، کیونکہ مَلِک خُدا تعالیٰ ہے، اور اس کی جانب سے امام مَلِک ہے، اگر دُوسروں کے بقول کسی باطل شخص کو مَلِک کہنا مناسب ہوتا تو سب سے پہلے اس کا اطلاق فرعون پر ہوتا، کیونکہ قرآن پاک میں اس کا ایک طویل قصّہ آتا ہے، مگر ایسا نہیں ہے، کیونکہ خُداوند تعالیٰ کا کلام قانُون ہے، لہٰذا وہ واحد و قہار اپنے قانُون سے کسی کافر کی ناجائز حکومت کی توثیق کرنا نہیں چاہتا۔

۲۰۔ سلمانِ فارسی سے متعلّق موضوع میں انبیائے قرآن کی عظیم حکمتوں کو بیان کرنا یہ خود سلمان کی روحانی اور علمی عظمت و بُزرگی کا ایک بیّن ثبوت ہے، لہٰذا آیئے ہم ایک بہت بڑی نعمت کی شناخت کر لیتے ہیں، وہ سِرِّ عظیم (بڑا بھید) سورۂ انبیاء (۲۱/۸۰) کے اِس مبارک ارشاد میں پوشیدہ ہے:

اور ہم نے اُس (یعنی داؤدؑ) کو ایک قسم کا لباس بنانے کی کاریگری سکھائی تمھارے لئے تاکہ وہ (لباس) تم کو تمھاری لڑائی سے بچائے پس کیا تم شکر کرنے والے ہو؟ یہ کونسی صنعت (کاریگری) تھی، جو خدا تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا؟ آیا یہ زِرہ بنانے کی کاریگری تھی؟ آپ اچھی طرح سے سوچ لیں۔

اِس ربّانی تعلیم میں جیسا کہ حکیمانہ خطاب فرمایا گیا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ یہ احسان ہر زمانے کے لئے ہے، اور جس نعمت کا یہاں ذکر

ہُوا ہے، وہ ایسی نہیں کہ دُنیائے ظاہر کی مادّی ترقّی اس کی اہمیّت، اور قدر و قیمت کو کم کرسکے، پس ایسا لباس جو خُدا کے بندوں کو جسمانی، رُوحانی، اور عقلی ہر گونہ جنگوں سے بچا سکتا ہے جسمِ لطیف ہے، اور یہی اللہ کا سب سے بڑا احسان ہے، اسی لئے شکر کرنے کا حُکم دیا گیا۔

تاریخِ امامت کا مُطالعہ حضرت آدمؑ سے شرُوع کرکے دیکھیں تو معلوم ہو جائے گا کہ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ یکے بعد دیگرے مرتبۂ امامت پر فائز ہو گئے تھے، چنانچہ یہ لباس آپ جب بھی دیکھ سکیں امام عالیمقام کا سب سے بڑا معجزہ ہوگا، اور جیسا کہ مذکورہ آیت سے ظاہر ہے امام برحقؑ کی یہ صنعت اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔

۲۱۔ قرآنِ حکیم میں جگہ جگہ جسمِ لطیف کا ذکر موجود ہے، اگر صرف رُوحانی جہاد کی مناسبت سے اس کا بیان مقصود ہے تو ہر ایسی آیت میں ذرا غور کریں، جس میں جنگی الفاظ میں سے کوئی لفظ مذکور ہو، جیسے فرمایا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ کر رکھا ہے جن کو تم لو گے (۴۸/۲۰) اس میں فلکی جسم اور رُوحانی جہاد کے نتیجے میں دُنیا کو فتح کرلینے کی بات ہے، اسی طرح سورۂ حدید ۵۷/۲۵ میں (لوہا) سے یہی کوکبی جسم مُراد ہے، سورہ نحل (۱۶/۸۱) میں آپ نے پڑھا ہوگا کہ سرابیل (کُرتے) اجسامِ لطیف ہیں، خُود قصّۂ سلیمانؑ میں سارے لشکر اسی جسمِ لطیف کے ذرّات ہیں (۲۷/۱۷) عفریتِ جنّی (۲۷/۳۹) اور وہ شخص جو کتابِ کائنات کی رُوحانی سائنس جانتا تھا (۲۷/۴۰) یہی زندہ جسمِ لطیف تھا، یاجوج و

ماجوج کا ذکر ہو چکا ہے، یاد رہے کہ جسمِ لطیف کا ذکر اُن لفظوں میں بھی ہے جو فرشتوں سے متعلّق ہیں۔

غلامِ غلامانِ امامِ زمان

نصیر الدین نصیر ہونزائی

یکم مارچ ۱۹۸۵ء

چند اعلیٰ سوالات

سوال ۱ : رُوح اور مادّہ میں سے کون سی چیز پہلے پیدا کی گئی ہے؟ ان دونوں میں کس کو تقدّم شرفی حاصل ہے؟

سوال ۲ : آپ کہتے ہیں کہ ہر چیز میں رُوح ہے، کیا جمادات میں بھی رُوح ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو وہ رُوح کس نوعیّت کی ہے، حالانکہ جماد بیجان چیز کو کہا جاتا ہے؟

سوال ۳ : آپ نے "وحدتِ کثرت نُما" کا تصوّر پیش کیا ہے، اس کی وضاحت کیجئے، تاکہ ہم اچھی طرح سے سمجھ سکیں۔

سوال ۴ : آپ نے اپنی کسی تقریر کے دَوران فرمایا تھا کہ اللہ تعالےٰ کا پسندیدہ عدد ایک (یعنی واحد) ہے، لہٰذا قرآنِ پاک میں یہاں جہاں خُدا کے تمام چیزوں کو شمار کر رکھنے کا ذکر آیا ہے، وہاں ایسے شمار سے ان چیزوں کی وحدت مُراد ہے، مگر قرآن میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں، جو کثرت کو ظاہر کرتی ہیں، جیسے سات آسمان، وغیرہ، تو کیا سات میں وحدت کی کوئی علامت ہو سکتی ہے!

سوال ۵ : براہِ کرم عُروۃُ الوُثقیٰ (۲/۲۵۶ ، ۳۱/۲۲) کی حکمت بیان کیجئے، کہ اِس کی تاویل کیا ہے؟

سوال ۶ : کیا ابرار یعنی نکوکاروں کا اعمال نامہ امامِ وقت علیہ السّلام میں ہوتا ہے یا عِلّیّین میں؟ جبکہ امام ایک پاکیزہ شخصیّت کا نام ہے اور عِلّیّین ایک بلند ترین جگہ ہے (۸۳/۱۸)؟

سوال ۷ : آیا صُوفیوں کا یہ دعویٰ درست ہے کہ علمِ تصوّف کا سرچشمہ مولا علیؑ کی ذاتِ عالی صفات ہے؟ اگر یہ حقیقت ہے تو کوئی مثال پیش کر کے وضاحت کریں۔

سوال ۸ : سلام، دارالسّلام اور اسلام ان تینوں الفاظ کے معنی اور حکمت بتائیے۔

سوال ۹ : "ایک میں سب اور سب میں ایک" کی ریاضی تحلیل کر کے سمجھا دیجئے، کہ کس طرح ایک ہستی میں ساری ہستیاں سمائی ہوئی ہیں اور یکسے وہی ایک ہر ہستی میں موجود ہے؟

سوال ۱۰ : وہ جامع جواب کونسا ہے، جس میں ہر بڑے سوال کا جواب مہیّا ہو؟

سوال ۱۱ : خُدا اور بندوں کا ازلی اور ابدی رشتہ کیا ہے؟ کیا یہ رشتہ بدعملی کے سبب ٹوٹ جاتا ہے یا ہمیشہ ایک شان سے قائم ہے؟

سوال ۱۲ : قرآنِ حکیم کہتا ہے کہ خُدا نے قلم کے ذریعے سے سکھایا (۹۶/۴) مگر یہ بات سب جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السّلام کو

Institute for Spiritual Wisdom Luminous Science
Knowledge for a united humanity

ظاہری قلم سے نہیں، بلکہ بطریقِ وحی سب کچھ سکھا دیا ہے، پھر یہاں قلم سے کیا مراد ہے؟

سوال ۱۳: ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (۷۵/۱۹) اس آیۂ کریمہ کی تفسیر و تاویل کیجئے۔

سوال ۱۴: خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السّلام کو کتابِ مستبین (۳۷/۱۱۷) عنایت کر دی تھی، یہ کونسی کتاب تھی؟

سوال ۱۵: یہ ہمارا ایمان ہے کہ نور ایک ہے، لیکن ہم ظاہری کائنات میں نور کی کثرت دیکھ رہے ہیں، جیسے سورج، چاند اور بے شمار ستارے، پس یہ تمام چیزیں نورِ واحد کی مثال کس طرح ہو سکتی ہیں؟

سوال ۱۶: ان دونوں طریقوں سے کونسا زیادہ صحیح اور آسان ہے؟

(۱) قرآن سے امام کو پہچاننا۔

(۲) امام سے قرآن کو پہچاننا۔

سوال ۱۷: کیا قرآن حکیم میں لامکان، لازمان، ازل اور ابد کا ذکر ہے؟ اگر ہے تو کس طرح سے ہے؟ وضاحت فرمائیے۔

سوال ۱۸: آیا اس دنیا میں کوئی ایسا فرد یا کوئی گروہ ہو سکتا ہے جو خدا سے دشمنی رکھتا ہو؟ اگر ایسا کوئی نہیں ہے تو پھر قرآن حکیم میں خدا کے دشمنوں کا ذکر کیوں ہے (۲/۹۸، ۴۱/۱۹)

نوٹ: ان سوالات کے جوابات کے لئے مورخہ ۲۴ فروری

۱۹۸۴ء کے کیسٹ کو سُنیں۔

نصیر الدین نصیر ہونزائی

۲۳۔ فروری ۱۹۸۴ء

ISW LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

اشاراتی زبان — ۲

مَیں نے کہا: اس نے کہا

۱۔ مَیں نے کہا: قرآنِ پاک میں بہت سے عالی شان درختوں کی الگ الگ تعریف و توصیف کی گئی ہے، جن میں سے بعض اس دُنیا سے متعلّق ہیں اور بعض بہشت سے، اُس نے کہا: ایسا نہیں، وہ درحقیقت ایک ہی درخت ہے، لیکن چونکہ قرآنِ کریم علم و حکمت کی جنت ہے، اور جنّت میں ہر چیز کے مختلف ظہورات ہوتے رہتے ہیں، لہٰذا یہی ایک درخت قرآنی بہشت میں کبھی زیتون (۲۴/ـــ) کی شکل میں جلوہ نمائی کرتا ہے، کبھی شجرِ طور (۲۸/۳۰) بن کر حاملِ نورِ نظر آتا ہے، کبھی شجرۃ طیّبہ (۱۴/۲۴) کی صُورت میں نُورانی پھل دینے لگتا ہے، کبھی درختِ انجیر (۹۵/۱) کبھی انار (۵۶/۶۸) کبھی انگور کی بیل (۱۶/۱۱) کبھی سدرہ (۵۳/۱۴) کبھی طوبیٰ (۱۳/۲۹) کبھی کھجور (۵۵/۶۸) کبھی کیلا (۵۶/۲۹) وغیرہ کی صُورت میں ظہور پذیر ہو جاتا ہے، جیساکہ قرآنِ حکیم زبانِ حکمت سے فرماتا ہے کہ حقیقت تو ایک ہی ہے، مگر اس کی مثالیں

بہت زیادہ اور گوناگون ہیں (۱۷/۸۹، ۳۰/۵۸)

۲۔ میں نے کہا: اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسمائے صفاتی ہیں، بلکہ اس کے ہزار نام ہیں، بلکہ ایک اور روایت کے مطابق کئی ہزار اسماء ہیں، اُس نے کہا: اچھی طرح کان لگا کر سُن لو، اگرچہ ظاہراً خُدا تعالیٰ بہت سے نام ہیں؛ لیکن دراصل اس کا صرف ایک ہی نام ہے، کیونکہ وہ واحد و یکتا ہے، چنانچہ اللہ پاک کا حقیقی نام اسمِ اعظم ہے، جو ہر زمانے میں زندہ و گویندہ ہے، اس سے انبیاء و ائمہؑ علیہم السّلام مُراد ہیں، اور دُوسرے لفظی نام علمی ظہورات بھی ہیں اور حجابات بھی، اور اگر ایسا نہ ہوتا تو قرآن مجید میں "الاسمآءُ الحسنیٰ" کا تصوّر ہی نہ ہوتا (۷/۱۸۰، ۱۷/۱۱۰، ۲۰/۸، ۵۹/۲۴)

۳۔ میں نے کہا: قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے کہ: قیامت کے دن الرّوح اور فرشتے (خُدا کے سامنے) صف باندھ کر کھڑے ہوں گے (۷۸/۳۸) اُس نے پُوچھا: کیا تم نے اس آیت میں یقوم (کھڑے ہوں گے) کی حکمت کو ٹھیک طرح سے سمجھ لیا ہے؟ آیا تم صف باندھنے کا مطلب بھی جانتے ہو؟ کیونکہ کھڑے ہونے سے انبعاث مُراد ہے، اور یہ واقعہ مقامِ عقل پر پیش آتا ہے، اور صف باندھنے کے معنی ہیں مُنظّم و مُتّحد ہونا ایک ہو جانا، یہ عالمِ شخصی کی بات ہے، کہ عالمِ صغیر کی رُوح اور جُملہ ملائکہ نورِ عقل کی ہمہ گیر نمائندگی میں ایک ہو جاتے ہیں، دیکھو صف باندھنے کی تشبیہہ و تمثیل سیسہ پلائی ہُوئی دیوار سے دی گئی ہے (۶۱/۴) ظاہر ہے کہ ایسی دیوار کسی درز و شگاف کے بغیر کُلّی وحدت و سالمیّت رکھتی ہے،

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

دُوسری مثال پرندوں کے پَر کھولنے سے دی گئی ہے، تُم دیکھتے ہو کہ پرندے سے پَر جُدا نہیں ہوتے (۶۷/۱۹)

۴۔ مَیں نے کہا: قرآنِ مقدّس میں یہ بھی ہے: اور تمھارا پروردگار اور فرشتے صف در صف آئیں گے (۸۹/۲۲) اُس نے کہا: خُوب یاد رکھو کہ ظاہر میں آنا جانا جسم کی صفت ہے، اور خداوند تعالیٰ ہر جسمانی صفت سے پاک و برتر ہے، چُنانچہ یہ ارشاد نُورِ عقل کے بارے میں ہے، جو اپنے ظہوراتِ عقلی میں نہ صرف فرشتوں کی نمائندگی کرتا ہے بلکہ ربِّ عزّت کا بھی مظہر ہے۔

۵۔ مَیں نے کہا: قرآنِ حکیم میں ارشاد ہے کہ: پھر جب (روزِ قیامت) آسمان پھٹ کر تیل کی طرح لال ہو جائے گا (۵۵/۳۷) اُس نے کہا: ہاں، مگر تم نے یہ نہیں سوچا ہے کہ اُس موقع پر آسمان صاف ہوگا یا ابر آلود؟ اور حق بات تو یہ ہے کہ یہ واقعہ بادلوں کے اوٹ کے پیچھے ہوگا، لہٰذا لوگ اُس سے بے خبر رہیں گے، یعنی یہ دراصل رُوحانیّت کا قصّہ ہے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے: اور جس دن آسمان بادل کے پھٹ جائے گا اور فرشتے نازل کئے جائیں گے جیسا کہ نازل کرنے کا حق ہے (۲۵/۲۵)، اِسی موضوع سے متعلق ایک اور اِرشاد یہ ہے: کیا وہ لوگ اس کے منتظر ہیں کہ حق تعالیٰ اور فرشتے بادل کے سائبانوں میں آئیں اور امر پورا ہو جائے (۲/۲۱۰) یاد رکھو کہ یہ سب عالمِ شخصی کے رُوحانی واقعات و معجزات ہیں، اور ان میں سے کوئی بات فرضی مثال نہیں، بلکہ حقائق ہی حقائق ہیں۔

۶۔ مَیں نے کہا: قرآنِ پاک کہتا ہے کہ: خُدا تعالیٰ نے رسُولوں

کے جُملہ علمی و عرفانی احوال کا اِحاطہ کر لیا ہے اور ہر چیز کو شمار کر رکھا ہے جیسا کہ شمار کرنا چاہیئے (۷۲/۲۸) اُس نے کہا : یہ کام اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسانِ کامل کے عالمِ شخصی میں کیا ہے، کیونکہ لوحِ محفوظ وہیں ہے، جان لو کہ احاطہ کرنا یعنی گھیرنا اس معنیٰ میں ہے کہ خُدائے علیم و حکیم نے حضراتِ انبیاء علیہم السّلام کے علُومِ مخفی کے گرداگرد ایک مضبُوط دیوار بنائی ہے، تاکہ کوئی شخص اذنِ خُداوندی کے بغیر اس میں داخل نہ ہو سکے، جیسے حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کی ذاتِ اقدس کو خُدائے پاک نے علم کا شہر اور حکمت کا گھر بنا کر اس کا دروازہ مولا علی علیہ السّلام کو قرار دیا تھا، اور یہاں یہ بھی یاد رکھو کہ خُدائے واحد کا تمام چیزوں کو شمار کرنا یہ ہے کہ اُس حکمت والے نے جُملہ اشیاء کو عددِ واحد میں سما دیا ہے، اور ایسا عدد جو ایک ہے مگر سب ہے، وہ نُورِ عقل ہے۔

۷ ۔ میں نے کہا : قرآنِ مقدّس میں پانچ بار لفظ ارائک استعمال ہُوا ہے، اُس میں سے ایک سورۂ یاسین (۳۶/۵۶) میں اس طرح ہے :۔

هُمْ وَأَزْوَاجُهُمْ فِي ظِلَالٍ عَلَى الْأَرَائِكِ مُتَّكِئُونَ (۳۶/۵۶)

وہ اپنی بیویوں کے ساتھ چھاؤں میں تکیے لگائے تختوں پر بیٹھے ہوئے ہیں ۔ اُس نے کہا : شاید تم اہلِ جنّت کو الگ الگ تختوں پر سمجھتے ہو، اِس لئے کہ تم ابتک اسرارِ وحدت سے ناواقف ہو، یاد رکھو کہ بہشت قانُونِ وحدت کے تحت ہے، لہٰذا وہاں سب کے سب ایک ہو جاتے ہیں، اور ان کے تخت بھی ایک ہو جاتے ہیں، مگر ہاں لاتعداد

علمی و عرفانی ظہورات ہوا کرتے ہیں، دوسری طرح سے بھی یہ سوچنا چاہیئے کہ جب
چہرۂ خدا میں سب لوگ فنا ہو جائیں گے (۵۵: ۲۶-۲۸) تو اس حال میں سب ایک ہو جائیں
گے، اور ظہورات میں ہر ایک کی انفرادیت قائم رہے گی جس طرح اس دنیا میں کوئی
شخص ایک ہوتا ہے، اس کی جان بھی ایک کہلاتی ہے، مگر اس میں بے شمار ذرّات ہوتے ہیں۔

۸۔ میں نے کہا: لفظِ سریر (تخت) کی جمع سُرُر جو قرآنِ مجید میں چار
بار مذکور ہے، اس سے متعلق ایک ارشاد یہ ہے: ونزعنا ما فی
صدورهم مّن غلٍّ اخوانًا علٰی سُرُرٍ متقٰبلین (۱۵: ۴۷)
اور ان کے دلوں میں جو کینہ تھا ہم وہ سب نکال دیں گے کہ سب بھائی بھائی
کی طرح تختوں پر آمنے سامنے بیٹھا کریں گے۔ اُس نے کہا: اگرچہ شروع شروع
میں یہ درست ہے کہ خدا کی وجہ سے دوستی اور خدا کی وجہ سے دشمنی کی جاتی
ہے، لیکن ایمان کے درجۂ کمال پر پہنچ جانے کے بعد معلوم ہو جاتا ہے کہ ایسی دشمنی
عارضی ہوا کرتی ہے، خداوندِ قدّوس دنیا ہی سے کامل انسانوں کے قلب
کو ہر قسم کی کدورت سے پاک و پاکیزہ رکھتا ہے، چنانچہ یہ ایک مجموعی
تذکرہ ہے، یا یہ کہا جائے کہ یہ عوام کی نسبت سے ہے کہ خدا اہلِ بہشت
کے دلوں سے کینہ نکال دیتا ہے، بہرکیف جب بہشت میں عداوت نہ
ہوگی تو دوستی و محبّت ہوگی، اور جب شدید محبّت ہوگی، تو پھر وحدت
ہی وحدت ہوگی، پس اِس ربّانی تعلیم کا اشارہ یہ ہے کہ تصوّرِ ازل و ابد
میں تمام انسانوں کو بہشت کے مساوی تختوں یعنی تختِ یک رنگی پر یکجا
قرار دیا جائے، اور ان کو آپس میں بھائی بھائی سمجھ لیا جائے، کیونکہ وہ

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science — Knowledge for a united humanity

سب کے سب اُس مقامِ اعلیٰ پر معنوی آدم و حوّا یعنی عقلِ کُلّی اور نفسِ کُلّی کی اولاد ہیں۔

۹۔ میں نے پوچھا: حُکما کا قول ہے کہ: لا یُولد الوحدۃ إلّا الوحدۃ = وحدت صرف وحدت ہی کو جنم دیتی ہے، اس کا مطلب کیا ہے؟ ایسی وحدت کونسی ہے جو ایک اکیلی ہونے کے باوجود ماں باپ کی سی دوئی اختیار کر کے وحدت کو جنم دیتی ہے؟ اُس نے جواب دیا: اس کا مطلب یہ ہے کہ عقلِ کُلّ اور نفسِ کُلّ ایک وجہ سے ایک وحدت کا نام ہے اور دُوسری وجہ سے یہ دو ہیں اور جُفتِ بسیط، چُنانچہ اس وحدت نے جو کچھ جنم دیا، وہ دراصل وحدت ہی ہے، دُوسرے لفظوں میں ان والدین سے جتنے لوگ پیدا ہُوئے، ان کے مجمُوعی وجُود کے دو پہلو ہیں، یعنی وہ ظاہراً کثیر ہیں اور باطناً ایک، جیسے اِن کے ازلی والدین میں دونوں باتیں پائی جاتی ہیں، اور یہاں یہ بات ہمیشہ کے لئے یاد رکھو کہ اِنسانوں کی وحدت ازلی اور ابدی ہے، اور کثرت عارضی اور چند روزہ ہے، پس حکماء نے اپنے اس قول میں موجُودات کے باطنی اور ازلی پہلو کو پیشِ نظر رکھا ہے۔

۱۰۔ میں نے کہا: سُورۂ حُجرات (۴۹/۱۰) میں فرمایا گیا ہے: إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ (۴۹/۱۰) مومنین تو سب بھائی ہیں سو اپنے دو بھائیوں کے درمیان صُلح کرا دیا کرو۔ اِس سے صرف یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ دینی برادری فقط مُسلمین و مومنین

تک محدود ہے، پھر ہم کس طرح یہ بات سمجھیں کہ سارے انسان دینی اخوّت کے رشتے میں منسلک ہیں؟ اُس نے کہا: توجّہ سے سُنو، قرآنِ کریم کی بہت سی آیاتِ کریمہ زبانِ تنزیل سے یا زبانِ تاویل سے کہہ رہی ہیں کہ دینِ اسلام عالمِ ذرّ میں ادیانِ عالم پر غالب آچکا ہے، اور آگے چل کر یہ واقعہ ظاہر میں بھی پیش آنے والا ہے، جیسے حضور انور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے فرمایا گیا: اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا (۴۸: ۱) بے شک ہم نے تم کو ایک کھلّم کھلا فتح دی۔ نیز فرمایا: (اے رسولؐ) جب خُدا کی مدد آپہنچے گی اور فتح ہو جائے گی، اور تُم لوگوں کو دیکھو گے کہ فوج در فوج خُدا کے دین میں داخل ہو رہے ہیں (۱۱۰: ۱-۲) یہ عالمِ ذرّ میں دینِ خُدا کی فتح کی مثال ہے، اِسی طرح سب لوگ پہلے تو درجۂ رُوح میں ناطقؑ اور اساس کے رُوحی فرزند ہوں گے، اور اس کے بعد مرتبۂ عقل میں عقلِ کُلّ اور نفسِ کُلّ کے عقلی فرزند قرار پائیں گے۔

۱۱۔ میں نے سوال کیا: قرآنِ حکیم میں ارشاد فرمایا گیا ہے: وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا (۲۱: ۸۷) اور مچھلی والے (پیغمبر یعنی یُونسؑ کو یاد کرو) جبکہ وہ خفا ہو کر چل دیئے۔ نیز دُوسرے مقام پر ارشاد ہے: نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ (۶۸: ۱) قسم ہے دوات کی اور قلم کی اور اُس چیز کی جو لکھتے ہیں۔ پہلی آیت میں نون مچھلی کا نام ہے اور دوسری آیت میں نون دوات ہے، ان دونوں چیزوں کے درمیان کیا تاویلی ربط ورشتہ ہے؟ اُس نے جواب دیا: حضرت یُونس علیہ السّلام کو جس مچھلی

نے نگل لیا تھا وہ آپ کی رُوحانیت کی ایک زبردست رُوح تھی، اور نون جہاں دوات ہے، جس کی خُدا قسم کھاتا ہے، اِس سے نفسِ کُلّی مراد ہے، جبکہ قلم کا مطلب عقلِ کُلّی ہے، اور یہ بھی یاد رکھو کہ جہاں نفسِ کُلّی کی مثال مچھلی ہے وہاں عقلِ کُلّی کی تشبیہہ سمندر ہے، کیونکہ جُملہ کائناتِ ظاہر بحرِ رُوح میں غرق ہے، اور یہ سمندر یعنی رُوحِ اعظم غریقِ بحرِ علم ہے، اور علم سے برتر و بیرون کوئی شئی نہیں۔

۱۲۔ میں نے کہا: جس طرح اہلِ بہشت کے لئے تختوں کے معنی میں سُرُر اور ارائِک جیسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، آیا اسی طرح لفظِ عرش بھی ان کے لئے استعمال ہوا ہے، یا یہ صرف حضرتِ رحمان کے لئے خاص ہے؟

اُس نے کہا: عرش جہاں لغوی معنی میں ہے، وہ عام ہے، اور جہاں اصطلاحی معنی میں ہے، وہاں یہ خاص ہے، تم سُورۂ نمل (۲۷/۲۳) میں دیکھو کہ ملکۂ سبا کا عرش (تخت) عام ہے، اور سُورۂ طٰہٰ (۲۰/۵) میں دیکھو یہ خاص ہے، تاہم عرش اصطلاحی معنی میں بھی بطریقِ حکمت اہلِ جنّت کے لئے مستعمل ہے، جس کی چند مثالیں درجِ ذیل ہیں:-

(الف:) عرش سب سے بلند ترین مثال ہے (۱۶/۶۰، ۳۰/۲۷) وہ دُنیا کی کسی مادّی شئی کی طرح بیٹھنے کی چیز نہیں، بلکہ دیکھنے کی چیز ہے، یعنی وہ نُورِ عقل ہے جس کا اہلِ بہشت انتہائی شوق سے مُشاہدہ کرتے ہیں۔

(ب:) جو لوگ چہرۂ خُدا میں فنا ہو جاتے ہیں، ان کے لئے عرش اپنے تمام معنوں کے ساتھ استعمال ہو جاتا ہے۔

(ج:) عرش نُور ہے اِس لئے جہاں نُورِ مومنین و مومنات کے

آگے اور دائیں پھلتا ہے وہاں وہ عرش سے وابستہ ہیں (۵۷/۱۲)

(د :) ہر مومن اور مومنہ کا عقلی جنم عرشِ اعلیٰ پر ہوتا ہے، یاد رکھو کہ انبعاث ہی عقلی جنم ہے۔

(ھ :) جس کو معرفت کے بھیدوں سے خُدا مل جاتا ہے اس کو عرش بھی مل جاتا ہے۔

(و :) عرش و کُرسی جیسا کہ ذکر ہُوا انسان کے عقلی والدین ہیں، لہٰذا ان کی گود میں پلنا لازمی ہے۔

(ز :) عرش عالمِ وحدت کا نام ہے، جہاں سب لوگ عقلی صورت میں ایک ہیں۔

(ح :) ہر عالمِ شخصی میں ایک عرش (تخت) اور رُوحانی سلطنت ہے۔

(ط :) بندۂ مومن کا قلب عرشِ الٰہی ہے، یعنی امامِ زمان صلوات اللہ علیہ، جو مومن کا حقیقی دِل ہے، جس سے مومنین وابستہ ہیں۔

(ی :) خُدا کا گھر اور خُدا کا تخت ایک ہی معنی میں ہیں، پس جو لوگ خانۂ خُدا میں داخل ہیں، ان کی انائے عُلوی یقیناً عرشِ اعلیٰ پر ہے۔

بندۂ کمترین

نصیر الدین نصیر ہونزائی

۳۱- جنوری ۱۹۸۵ء

۱۰۴
سُورۂ ہُمَزَہ (۱-۹)

(ترجمہ) ہلاکت ہے ہر اس شخص کے لئے جو (مُنہ در مُنہ) طعن اور (پیٹھ پیچھے) بُرائی کرتا ہے، جس نے کچھ مال جمع کیا اور گن گن کر رکھا، وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا، ہرگز نہیں، وہ شخص تو ریزہ ریزہ کردینے والی جگہ میں پھینک دیا جائے گا، اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ ریزہ ریزہ کر دینے والی جگہ؟ اللہ کی آگ، خُوب بھڑکائی ہوئی، جو دِلوں تک پہنچے گی۔ وہ اُن پر ڈھانک کر بند کردی جائے گی (اس حالت میں کہ وہ) لمبے لمبے ستونوں میں کھڑے ہوں گے)۔

تاویلی حکمت: ہر ایسے شخص کے لئے رُوحانی ہلاکت ہے جو جہالت و نادانی اور کوُر باطنی کی وجہ سے ہادیٔ برحق پر طعن اور بُرائی کرتا ہے، جس نے کچھ مال جمع کیا، یعنی کچھ ظاہری علم حاصل کیا جو بہت قلیل ہے، جس کو وہ بہت زیادہ شمار کرتا ہے، یعنی اس کے نزدیک یہ محدُود علم بے شمار ہے، جس کے سبب سے اس کو گھمنڈ ہو گیا ہے، وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا یہ علم ہمیشہ کارآمد ثابت ہوگا، ہرگز ایسا نہیں، وہ آدمی تو ریزہ ریزہ

ISW Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science Knowledge for a united humanity

کر دینے والی جگہ میں پھینک دیا جائے گا، یعنی داعی کے عالمِ شخصی میں جہاں درجہ بدرجہ ذرّات ہیں، جہاں نُور بھی ہے اور نار بھی، علم بھی ہے اور جہالت بھی، اور سب سے بڑا عذاب عقلی عذاب ہے جو جہالت و نادانی کی صُورت میں دِل کو جلاتا رہتا ہے، پس وہ ۱۹ ستونوں میں گھرے ہوئے ہوں گے (۴۷/۳۰) جیسا کہ ارشاد ہُوا ہے :-

انیس ۱۹ کارکُن دوزخ پر مقرّر ہیں، ہم نے اس کے یہ کارکُن فرشتے بنائے ہیں، اور انکی تعداد کو کافروں کے لئے آزمائش بنایا ہے، تاکہ اہلِ کتاب کو یقین آجائے اور ایمان والوں کے ایمان میں اضافہ ہو (۷۴/۳۰-۳۱)

مذکورہ ۱۹ فرشتے :

(الف :) صاحبانِ دَورِ بُزرگ ۷ + اُن کے حُجّتانِ جزائر ۱۲ = ۱۹

(ب) چھوٹے دَور کے أئمّہ ۷ + جزائر کے حُجّت ۱۲ = ۱۹ (مُلاحظہ ہو کتابِ وجہِ دین، کلام ۱۴/۷)

ذرّاتِ ارواح کِس طرح حدُودِ دین سے وابستہ رہتے ہیں، اس کے بارے میں ایک کلیدی حکمت سورۂ یاسین (۳۶/۴۱) میں ہے، اور وہ ارشاد یہ ہے : اور ایک نشانی ان کے لئے یہ ہے کہ ہم نے اِن کے ذرّاتِ (ارواح) کو بھری ہُوئی کشتی میں سوار کیا، اور ہم نے ان کے لئے ویسی ہی کشتیاں پیدا کیں جن پر یہ سوار ہوتے ہیں (۳۶/۴۱-۴۲) اس سے ظاہر ہے کہ تمام ذرّاتِ ارواح کشتیٔ نوحؑ میں سوار تھے، یہ کشتی رُوحانیّت کی

ہوا کرتی ہے، اور ہمیشہ امامِ برحقؑ اور آپؑ کے حدود کی رُوحانیّت سے بنائی جاتی ہے، جس سے لوگ شعوری یا غیر شعوری حالت میں وابستہ رہتے ہیں۔

آپ اِس قرآنی منطق میں خُوب غور کریں کہ تمام چیزوں پر خزائنِ الٰہی محیط ہیں، اور کوئی شئی ان خزانوں سے باہر نہیں (۱۵/۲۱) تو پھر بہشت اور دوزخ کو خُدا کی اس بادشاہی سے باہر کہاں ہونا چاہیئے؟ کوئی حکومت جتنی ترقّی یافتہ ہوتی ہے، اس کا جیل (JAIL) اِتنا مُنظّم ہوتا ہے ہرچند کہ مُجرموں کے لئے وہ بُری جگہ ہے، لیکن اصلاحِ مُعاشرہ کے لئے اس کی بڑی ضرورت ہوتی ہے، چُنانچہ قید خانہ لوگوں کے وطنِ عزیز کے اندر ہوتا ہے، باہر نہیں۔

نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائیؔ

۲۵۔ نومبر ۱۹۸۴ء

گُلہائے دانش

خانۂ حکمت اور ادارۂ عارف کے جُملہ جاں نثاروں کے نام پر، جو شرق و غرب میں رہتے ہیں، خُداوندِ عالم اپنی خاص رحمتوں اور برکتوں سے ان عزیزوں کو نوازے!

یہ عاجز بندہ انتہائی عاجزی اور خلوص سے یاعلی مدد کی حکمت آگین دُعا کرتا ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ خواہش یہ بھی ہے کہ یہی پاک و پاکیزہ دُعا آفاق و انفس کے تمام ذرّات سے گونج اُٹھے، تاکہ گوشِ ہوش کو رازِ رُوحانیّت کی خبر ہو، اور ابوابِ عرفان یکے بعد دیگرے کھُلتے جائیں۔

۱۔ ہر عزیز کو یہ پُر حکمت اخلاقی اصول ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ حُسنِ عمل کی سب سے بڑی طاقت عاجزی اور فروتنی میں پوشیدہ ہُوا کرتی ہے، جیسا کہ قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے: وقولوا لِلنّاسِ حُسناً (۲/۸۳) اور لوگوں سے اچھی طرح بات کرو۔ اِس حُکم میں گفتگو کی تمام تر خُوبیوں کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے، کیونکہ خُدا تعالیٰ کا ہر فرمان تمام متعلّقہ معنوں پر

محیط ہوتا ہے، پس اس ربّانی تعلیم میں لوگوں سے بات چیت کرنے کی ظاہری خوبیوں کے علاوہ باطنی خوبیاں بھی مقصود ہیں۔

۲۔ آپ اپنی ذات میں یا کسی دوسرے مومن میں اللہ تعالیٰ کے اِس حکیمانہ انعام کے اشارے پر بخوبی غور کر سکتے ہیں جو کسی عُمدہ سے عمدہ عبادت کے بعد رقّتِ قلبی اور عاجزی کی صورت میں مِل جاتا ہے، قانونِ فطرت کا یہ اشارہ نورِ ہدایت کی جانب سے ایک عقلی معجزہ ہے، جو زبانِ حال سے یہ کہتا ہے کہ تم اِسی شاہراہِ مستقیم پر ثابت قدم رہو، اور اِسی رُوحانی لذّت و شادمانی کو اپناتے رہو جو ہر وقت کسرِ نفسی اور تواضع سے ملتی رہتی ہے۔

۳۔ ارشادِ نبوی ہے کہ: اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِکْمَۃً۔ بیشک بعض نظمیں حکمت ہُوا کرتی ہیں۔ یعنی جن کا نظریّہ صحیح نہ ہو ان کی شاعری بے مغز اخروٹ کی طرح ہوتی ہے، اور جن لوگوں کا عقیدہ حقیقت پر مبنی ہو، اُن کے اشعار علم و حکمت کے مغز سے بھرپور ہوا کرتے ہیں، اس لئے کہ وہ حق و حقیقت کی نمائندگی و ترجمانی کرتے ہیں۔

۴۔ قرآنِ کریم (۹/۱۶) میں قلبی دوستی (وَلِیجَۃً) کا ذکر آیا ہے، جو خُدا، رسُولؐ، امامِ زمانؑ، اور مومنین کے لئے خاص ہے، وَلیجہ کا مادّہ "ول ج" ہے، جس کا مصدر وُلُوج (داخل ہونا) ہے چُنانچہ اس لفظ (وَلِیجَۃً) کی تاویل ہے خُدا، پیغمبرؐ اور امام کے نُور اور مومنوں کی رُوح کو دِل میں داخل کر لینا اور حقیقی معنوں میں اپنائے رکھنا، اس آیۂ کریمہ میں

امامِ عالیمقامؑ کا ذکرِ جمیل دو طرح سے فرمایا گیا ہے: خلیفۂ رسولؐ کی مرتبت میں اور امیر المؤمنین کی حیثیت سے، کیونکہ منصبِ جلیلۂ نبوّت کا لازمہ خلافت (امامت) ہے، اور لفظِ "مومنین" میں ہمیشہ سردارِ مومنین ساتھ ہے۔

۵۔ حضرت مولانا امام سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ کا ارشادِ گرامی ہے: "اسماعیلی عقیدہ نور کی طرح ہے، تم نور جیسے بن جاؤ، آگ کی مثال نہ بنو، ایک اسماعیلی کے لئے مناسب نہیں کہ وہ کسی شخص سے دشمنی کرے یہاں تک کہ تم غیر مسلم کا بھی (خواہ مخواہ) دشمن نہ ہو جاؤ"۔ اسماعیلی مذہب کی بے مثال رواداری اور وسعتِ قلبی کا یہ عالم ہے، تاہم امامِ عالیمقامؑ کی اس نورانی ہدایت سے مذکورۂ بالا آیت کی تاویل متأثّر نہیں ہوتی، کیونکہ دوستی کے دو درجے ہیں: ایک ہے انسانی رُوح میں دوستی، اور دوسرا ہے مذہبی رُوح میں دوستی۔

۶۔ اہلِ ایمان کی سب سے بلند ترین صفت تقویٰ یعنی خوفِ خدا ہے، اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی نظر میں سب سے بڑھ کر متّقی ہے وہی سب سے بڑا معزز ہے (۴۹/۱۳) مگر یہ تقویٰ جو آسمان معیار کے مطابق ہے علمِ لدنّی پر مبنی ہے (۳۵/۲۸) اور یہ مرتبۂ اعلیٰ سب سے پہلے سرورِ انبیاء صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کو پھر امامِ برحقؑ کو حاصل ہے، اور اسی وسیلے سے سب فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

۷۔ سُورۂ نور (۲۴/۵۵) میں اللہ تعالیٰ نے کامل ایمان والوں سے جس خلافتِ ارضی کا وعدہ فرمایا ہے، اور جیسی اس کی مثال زمانۂ ماضی سے دی گئی ہے، وہ دراصل عالمِ شخصی کی خلافت ہے، جس میں یہ ممکن اور بڑی گنجائش ہے کہ

اہلِ بہشت کی طرح ہر مومن اپنے انفرادی عالم میں خلیفہ ہو، اور کوئی شک نہیں کہ اِسی مقصد کے پیشِ نظر ہر شخص کی ذات میں ایک کائنات پوشیدہ رکھی ہوتی ہے۔

۸۔ یہ کیوں ایسا ہے کہ خلافتِ کبریٰ اور خلافتِ صغریٰ کا تعلق آسمان سے نہیں بلکہ زمین سے ہے؟ اِس لئے کہ اس منصبِ جلیلہ کا مقصد لوگوں کی اصلاح ہے، اور لوگ زمین پر رہتے ہیں، تاہم خلیفۂ خُدا کے لئے فرشتوں کی اطاعت (سجدہ) کرنے میں بڑی حکمت پوشیدہ ہے کہ ملائکہ گویا آسمانی مخلوق ہیں، اس معنیٰ میں خلیفۂ خُدا کو آسمان بھی مُسخّر ہے (۳۱/۲۰)

۹۔ بڑی خلافت کے تحت زمینِ ظاہر اور زمینِ باطن دونوں آتی ہیں، اور یہ مرتبہ انبیا و ائمہؑ علیہم السّلام کے لئے مخصوص ہے، اور چھوٹی خلافت کے تحت صرف باطنی زمین آتی ہے، جس کا دُوسرا نام عالمِ صغیر یا عالمِ شخصی ہے، تاہم اس پوشیدہ دُنیا میں وہ سب کچھ ہے، جو دُنیائے ظاہر میں ہے، کیونکہ یہ اِس مادی کائنات کی لطیف روحانی صورت ہے، جیسے ایک قرآنی آیت کا مفہوم ہے کہ آسمان (کائنات) کے کثیف چھلکے کو اُتار کر لطیف صورت میں پیش کیا جائے گا (۸۱/۱۱)

۱۰۔ خالقِ برحق نے جتنی دُنیائیں پیدا کی ہیں، اُن سب میں بہترین دُنیا عالمِ شخصی ہے، جس کو قرآنِ حکیم نے "احسنِ تقویم" کا خطاب (TITLE) دیا ہے (۹۵/۴) اور اِنسانوں کو عالمین (دُنیائیں) کہا ہے، اس کا یہ مطلب ظاہر ہے کہ ہر شخص اپنی ذات میں بحدِّ قوّت ایک کائنات ہے، مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اِس کثرت سے دُنیائیں کیوں ہیں؟ اِس کا جواب

یہ ہے کہ بشرطِ اطاعت ہر شخص کو بہشت کی ایک سلطنت دینے کے لئے یہ اہتمام فرمایا گیا ہے۔

۱۱۔ قرآنِ مُقدّس میں جہاں سے جہاں تک اصنام پرستی (بت پرستی) کا موضوع پھیلا ہُوا ہے اس میں یہ جان لینا ضروری ہے کہ بُت ظاہری اور باطنی دو قسم کے ہُوا کرتے ہیں، چُنانچہ دُنیا میں اکثر لوگ ایسے ہیں، جو دُوسروں کی بُت پرستی پر طنز و تشنیع تو کرتے رہتے ہیں مگر اپنی بُت پرستی کو نہیں سمجھتے۔

۱۲۔ انسان کا حقیقی دِل امامِ عالی مقام ؑ ہے، جس کو قرآن حکیم نے قلبِ سلیم (۲۶/۸۹، ۳۷/۸۴) اور قلبِ مُنیب (۵۰/۳۳) کہا ہے، یہی حقیقت انائے عُلوی بھی ہے، یعنی وہ دِل جو خُدا کو سونپا گیا ہے اور رجُوع کیا گیا ہے، اب اگر آدمی اور اس کے دِل کے درمیان کوئی بڑی آزمائش حائل ہو گئی ہے، تو اس میں کامیاب ہو کر اپنے قلب تک پہنچ جانے کے لئے علم و عمل کی سخت ضرورت ہے۔

۱۳۔ قرآنِ حکمت آگین کا ارشاد ہے کہ شیطان کو کام کرنے کی جو مہلت دی گئی ہے، وہ کسی کی انفرادی قیامت میں منزلِ انبعاث تک ہے، اور ایک حدیثِ شریف سے اس حقیقت کی تصدیق ہو جاتی ہے، کہ ہر شخص کا ایک انفرادی شیطان ہوا کرتا ہے، اور حضور اکرم ؐ کا شیطان ختم ہو گیا تھا، یعنی آنحضرت صلعم کے انبعاث کی وجہ سے شیطان کی مہلت ختم ہُوئی تھی، اور وہ مسلمان بن گیا تھا، اب اس میں سب سے بڑا دلچسپ سوال یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ کیوں ایسا ہے؟ اور اس میں راز کی بات کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شیطان کی شکست حقیقی علم میں ہے، چنانچہ جوں جوں علم و حکمت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے،

توں توں شیطان کمزور ہوتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ انبعاث کا وقت آتا ہے اور اس کی مہلت بالکل ختم ہو جاتی ہے۔

۱۴۔ یہ کہنا عجیب ہے کہ شیطان کے پاس بہت علم تھا، کیونکہ اگر اس کے پاس حقیقی علم ہوتا تو وہ ہرگز گمراہ نہ ہوتا، مگر ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اس نے بہت بندگی کی ہو اور علم کے نام سے بہت سی باتیں بغیر کسی حقیقت کے جانتا ہو جیسا کہ قرآنِ حکیم کی ایک آیۂ مبارکہ کا مفہوم ہے کہ: انسی اور جنّی شیاطین سوائے ایسی باتوں کے جو (اندر سے خالی خولی اور) اُوپر سے مُلمع کی ہوتی ہیں کچھ نہیں جانتے ہیں (۶/۱۱۲)

۱۵۔ قرآنِ پاک کے معرُوف ناموں میں سے ایک نام "ذکر" ہے (۲۱/۵۰) اور پیغمبرِ خُدا صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا ایک بابرکت نام بھی ذِکر ہے (۶۵/۱۰-۱۱) اور آپ جانتے ہیں کہ ذکر کے معنی یادِ خُدا کے بھی ہیں اور نصیحت کے بھی، چنانچہ جو لوگ قرآنی علم کو حاصل کرتے ہیں۔ وہ نہ صِرف اللہ کی یاد کرتے اور نصیحت سُننے کا ثواب پاتے ہیں، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان کو رسُولؐ اور اہلِ ذکر یعنی أئمہؑ کی ہمنشینی کا ثواب بھی مل جاتا ہے

۱۶۔ عبادت و بندگی کے کئی پہلو ہیں، بالفاظِ دیگر اللہ جلّ شانہ، کی غلامی کی بہت سی صُورتیں ہیں، ان میں قرآنی علم کی خدمت ایک افضل و اعلیٰ عبادت ہے، جبکہ قرآن اِسلام و ایمان کی اصل و اساس ہے، اور جبکہ قرآن خُداوند تعالیٰ کی آخری پیاری کتاب ہے۔

۱۷۔ سُورۂ نمل میں فرمایا گیا ہے: اور جب قولِ قیامت اُن پر واقع

ہوگا تو ہم ان کے لئے زمین (یعنی ارضِ رُوحانیّت) سے ایک جانور نکالیں گے جو ان سے باتیں کرے گا کہ لوگ ہماری (یعنی اللہ کی) نشانیوں پر یقین نہ لاتے تھے (۲۷/۸۲) دابۃ الارض سے مولا علی علیہ السّلام کی وہ مرتبت مُراد ہے جو وقت آنے پر بصُورتِ ذرّاتِ رُوح بولنے لگتی ہے، اور خدا کی نشانیوں کے معنی ہیں أئمّۂ طاہرین علیہم السّلام۔

۱۸۔ آپ کو اس بات کا علم ہے کہ بموجبِ حدیثِ سفینۂ نوح اہلِ بیتِ رسُول ص کی مثال ہے، سو آیئے ہم اس کی مربُوط حکمت قرآنِ حکیم میں دیکھتے ہیں، ارشاد ہے: پھر ہم نے نوح ع اور کشتی والوں کو بچا لیا اور ہم نے اس (یعنی کشتی) کو دُنیا والوں کے واسطے ایک نشانی بنایا (۲۹/۱۵) متعلقہ حدیثِ شریف کی روشنی میں اس آیۂ کریمہ کے اشارے یہ ہیں کہ کسی بھی صورت میں ہمیشہ طوفان برپا ہوتا رہتا ہے، جس سے لوگوں کے بچ جانے کا وسیلہ پیغمبرِ برحق ص کے اہلِ بیت ہیں، اور خداوندِ عالم نے اس وسیلۂ نجات کو ایک مستقل آیت کے طور پر قائم رکھا ہے، تاکہ دینِ اسلام کے وسائل میں کوئی کمی واقع نہ ہو، کیونکہ دینِ فطرت کامل اور مکمّل ہے، اور اللہ تعالیٰ کی نعمت بدرجۂ تمام وکمال موجود ہے (۵/۳)

۱۹۔ حضرت نوح علیہ السّلام نے ایک پُرحکمت دعا اس طرح کی :-

رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ (۷۱/۲۸) اے میرے ربّ مجھ کو میرے ماں باپ کو بخشدے اور جو (خاص) مومن ہو کر میرے (اہلِ) بیت میں داخل

ہیں انکو اور (عام) مومنین اور مومنات کو بھی۔ اِس آیۂ مُبارکہ میں سب سے بڑی حکمت یہ ہے کہ جس طرح حضرت نوحؑ کے اہلِ بیت سے ایک فرد نافرمان ہوکر خارج ہوگیا تھا، اسی طرح کئی افرادِ حقیقی فرمانبرداری سے آپؑ کے اہلِ بیت میں داخل وشامل ہوگئے تھے۔

۲۰۔ انبیاء وائمہ علیہم السّلام کے گھر سے ان کی روحانیت و نورانیت مُراد ہے، جس میں مومنین کا آج یا کل داخل ہونا لازمی ہے، ورنہ جسمانی حالت میں ہادئ برحق کے گھر میں اہلِ ایمان کا داخل ہوجانا ضروری نہیں، پس یہی وجہ ہے کہ زمانۂ نبوّت کے اہلِ بیت محمّد رسُول اللہؐ، علی مُرتضیٰؑ، فاطمۂ زہرا، اور حسنینؑ صلوات اللہ علیہم تھے، اور سلمان فارسی کی مثال سے یقین آتا ہے کہ اور بھی کئی مومنین خانۂ نوُر میں داخل ہوگئے تھے اگرچہ ان کے نام ظاہر نہیں، کیونکہ امامؑ اِسی مقصد کے لئے دین کا زندہ راستہ یعنی صراطِ مُستقیم بھی ہے، راہنما بھی ہے، اور شہرِ رُوحانیت کا دروازہ بھی، تاکہ مومنین کو منزلِ مقصُود تک پہنچادیا جائے۔

۲۱۔ قرآنِ پاک کا ارشاد ہے کہ: جو شخص نیک کام کرے گا اُس کو دس گُنا بدلہ ملے گا (۶/۱۶۰) یعنی جو اِس دُنیا میں ایک نیکی کرے، اس کو آخرت میں دس نیکیاں ملیں گی، اِس کی تاویلی حکمت یہ ہے کہ جو شخص دعوتِ حق کو قبوُل کرکے مُستجیب بن جاتا ہے، تو وہ ایک بہت بڑی نیکی کرتا ہے لہٰذا اسے دس حصّہ نیکی ملے گی، جو اس طرح ہے: مُستجیب۱، ماذونِ اصغر۲، ماذونِ اکبر۳، داعئ مکفوف۴، داعئ مُطلق۵، حُجّتِ جزیرہ۶، حُجّتِ اعظم۷، امامؑ۸،

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

اساس ؑ، اور ناطق ؐ، یہ نیکی کے وہ دس درجات ہیں، جو تمام نیکیوں پر محیط ہیں۔

۲۲۔ قرآنِ کریم میں جہاں جہاں کسی کام کے لئے حُکم دیا گیا ہے، اس کا اطلاق عمل کے ادنیٰ اور اعلیٰ تمام مدارج پر ہوتا ہے، مثال کے طور پر الگ الگ آیتوں میں ۲۷ بار وَاعْلَمُوا (اور جان لو) فرمایا گیا ہے، جس کا مقصد صرف یہی نہیں کہ لوگ دُنیا میں علم کو حاصل کرتے رہیں، بلکہ آخرت میں بھی علم سے وابستہ رہنا ہے، جیسے ارشاد ہُوا ہے: وَاعْلَمُوا اَنَّ اللّٰہَ یَحُولُ بَینَ المرءِ وقلبِہٖ وَاَنَّہٗ الیہ تحشرون (۸/۲۴) اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ آڑ بن جایا کرتا ہے آدمی اور اس کے قلب کے درمیان اور بلاشبہ تم سب کو اس کے پاس جمع ہو جانا ہے پس اس امر کا منشا یہ ہے کہ ذاتِ انسانی سے متعلق علم و معرفت کو بدرجۂ تمام وکمال حاصل کیا جائے، تاکہ یہ راز معلوم ہو سکے کہ کس طرح خُدا بندۂ مومن اور اس کے دِل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے؟ الحمدُ للہِ ربِّ العٰلمین۔

بندۂ غریب

نصیر الدین نصیر ہونزائی

۵۔ نومبر ۱۹۸۴ء

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

دو انتہائی عظیم فرشتے

ترجمہ از

دیوانِ پیر ناصر خسروؒ ق س

مطلع : بالای ہفت چرخ مُدَوّر دو گوہر ند

ب ۱ : ان سات گول آسمانوں کے اُوپر دو گوہر ہیں، جو حقائق آسمان سے اُوپر یا باہر ہیں، وہ ازلی، ابدی اور لامکان ہیں جن کے نُور سے عالم اور انسان منوّر اور درخشاں ہیں۔

ب ۲ : یہ دونوں خود تو شکل و صُورت سے برتر ہیں، مگر تصویر بنانے والے ہیں اور نیستی کی بچّہ دانی میں ہستی کے نطفہ سے تصویر بنا دیتے ہیں۔

ب ۳ : وہ اِن چیزوں میں سے نہیں جو محسوسات کہلاتی ہیں، وہ حواس میں نہیں سماتے، اور نظر نہیں آتے، کیونکہ وہ نہ تو تاریک ہیں اور نہ ہی روشن۔

ب ۴ : یہ قدیم یعنی ازل کی بات ہے کہ وہ دایۂ قدس کے پروردہ ہیں۔ وہ گوہر نہیں اگرچہ اوصافِ گوہر رکھتے ہیں۔

ب ۵ : آفرینش کی اِس جانب سے بھی اور کائنات کی اُس طرف (یعنی لامکان) سے بھی، حدُودِ زمان میں بھی اور لازمان میں بھی وہ ساتھ

رہتے ہیں۔

ح ٦ : وہ ایک اعتبار سے اس جہان میں نہیں ہیں اور دُوسرے اعتبار سے اس میں موجود ہیں، وہ ہم میں غیر موجود بھی ہیں اور ہمارے بدن میں رُوح پرور بھی۔

ح ٧ : کہتے ہیں کہ انہی معنوں میں وہ دونوں گوہر دونوں جہان کی حیثیت سے ہیں، اسی طرح وہ سات اقلیم میں حاضر بھی ہیں اور غائب بھی، یعنی دُنیا ہونے کی مرتبت میں عیان اور آخرت ہونے کی مرتبت میں نہان ہیں۔

ح ٨ : ان میں سے ایک رُوحِ قدسی کا درجہ رکھتا ہے اور دُوسرا جبرائیل کی ذات ہے، یعنی یہ دونوں پرواز کرنے والے فرشتے ہیں مگر مادّی قسم کے پر نہیں رکھتے۔

ح ٩ : تعجّب ہے کہ یہ دونوں فرشتے عالمِ سفلی میں پروں کے بغیر پر کھولے بیٹھے ہیں، اور بازوؤں کے بغیر عالمِ عُلوی پر اُڑ جاتے ہیں۔

ح ١٠ : دُنیا کے عناصرِ اربعہ جو گرم، سرد، خشک اور تر ہیں، یعنی مٹّی، ہوا، پانی اور آگ، ان کے ساتھ وہ گوہر موافقت رکھتے ہیں۔

ح ١١ : گنج خانۂ ازل میں اور خزینۂ ابد میں یہ دونوں، جوہر (گوہر = موتی) نہیں، لیکن مثال کے طور جوہر کے نام سے ہیں۔

ح ١٢ : یہ دونوں گوہر عالَم بھی ہیں اور آدم بھی، دوزخ بھی ہیں اور بہشت بھی، حاضر بھی ہیں اور غائب بھی، زہر بھی ہیں اور شہد بھی۔

ح ١٣ : اور نُور سے لے کر ظلمت تک بلندی سے لے کر پستی تک،

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science

مشرق سے لے کر مغرب تک اور سمندر سے لے کر خشکی تک یہی محیط ہیں۔

ع ۱۴ : یہ موجود بھی ہیں اور معدوم بھی، باطن بھی ہیں اور ظاہر بھی، اسی سبب سے یہ تجھ سے الگ بھی ہیں اور تیرے ساتھ ایک ہی گھر میں بھی رہتے ہیں۔

ع ۱۵ : دوسرے جہان میں کہ وہ ان کا کارخانہ ہے، یہ ہر عمارت اور اس کے بانی کو فنا کر ڈالتے ہیں۔

ع ۱۶ : حواسِ خمسہ اور چار طبائع یعنی، مٹّی، پانی، ہوا اور آگ کے روزی دینے والے ہیں، اور نو آسمانوں اور سات ستاروں کے خالی کرنے والے ہیں، جس کا مطلب ہے زمین کی طرف گوناگوں قوّتوں کا فیض بھیجتے رہنا۔

ع ۱۷ : اُن سے مشرّف و مُستفید ہونے والے دس ہیں جو ان کے دولت کدہ کے گرداگرد بیٹھے ہوئے ہیں، ان سے پانچ اندر جا سکتے ہیں اور پانچ نہیں جا سکتے، یعنی پانچ حواسِ ظاہر اور پانچ حواسِ باطن۔

ع ۱۸ : دونوں کے سامنے آسمانِ ظاہر اور آسمانِ باطن دونوں کا

نوٹ : دو گوہر سے عقلِ کُلّ اور نفسِ کُلّ مُراد ہیں، اور دو انتہائی عظیم فرشتے یہی ہیں۔

بعض جگہوں میں آزاد ترجمہ کیا گیا ہے۔

دکاندار کھڑا ہے، اور وہ جو کچھ بتدریج فروخت کرتا ہے تو یہ اسے خرید لیتے ہیں۔

ح ۱۹ : وہ بادشاہ جس کے دس سر چھ چہرے اور سات آنکھیں ہیں، اور چار افراد جو ہمیشہ آپس میں جھگڑتے رہتے ہیں، یہ گوہر ان سب کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہتے ہیں، بادشاہ سے کائنات مُراد ہے، جس کے دس سر ہیں یعنی نو آسمان اور زمین، چھ چہرے ہیں یعنی چھ اطراف، اور سات آنکھیں ہیں یعنی سات ستارے، اور چار مخالف افراد چار عناصر ہیں۔

ح ۲۰ : وہ جوہر نہیں ہیں، ان کا جوہر عَرَض ہے، نوٹ : جوہر کے دو معنی ہیں : (۱) گوہرِ عقل، یعنی مثلِ اعلیٰ کا موتی (۲) وہ چیز جو بذاتِ خُود قائم ہے، جیسے کاغذ کہ از خُود قائم ہے، مگر تحریر کاغذ پر قائم ہے، پس کاغذ جوہر ہے اور تحریر عَرَض۔ یعنی جو جوہر ان کی مثال کو پیش کرتا ہے، وہ اپنے آپ قائم نہیں بلکہ یہ ان دونوں پر قائم ہے، اس معنیٰ میں یہ جوہر دراصل عَرَض ہے، اُنھوں نے عَرَض کے مدار و محور کو بنایا ہے اور وہ خُود محور نہیں ہیں۔

ح ۲۱ : یہ تجُھ کو ظاہری حرُوف کے بغیر کتابِ اسرار پڑھ کر سُنا سکتے ہیں، اور دیکھے بغیر اعمال کو جانتے ہیں۔

ح ۲۲ : ان کا ظاہر ہو جاتا اس لئے ہے کہ یہ در اصل باطن میں ہیں، یہ اپنا جسم اور سر نہیں رکھتے کیونکہ یہ ہر تن اور ہر سر میں ہیں۔

ح ۲۳ : یہ ان کی صفات میں سے ہے کہ کائنات میں نہیں سماتے، لیکن اس کے باوجود وہ دونوں ہمارے جسم و سر میں مضمر ہیں۔

۲۴ء : یہ مکان تیرے ہی واسطے بنایا گیا ہے، ورنہ ان کے لئے مکان کی کیا اہمیّت ہے، کہ وہ تو مکان سے برتر ہیں۔

۲۵ء : وہ ایک ایسی جگہ سے تیری طرف آئے ہیں کہ وہ در اصل جگہ ہی نہیں بلکہ لامکان ہے، وہ وہاں فرشتے ہیں اور یہاں پیامبر ہیں۔

۲۶ء : وہ صفات میں درجۂ ملکُوت سے بالاتر ہیں، کیونکہ وہ ذات ذُو الجلال کی طرح نہ عنصر ہیں اور نہ جوہر۔

۲۷ء : اِس حقیقت کے باوجُود کہ دونوں جہان اِن دونوں کے زیرِ نگین ہیں، اگر تُو چاہے تو یہ تیری رُوح کے تابعِ فرمان ہو سکتے ہیں۔

مُترجم:
نصیر الدین نصیر ہونزائی
۱۴- مارچ ۱۹۸۴ء

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

موت کی عظیم حکمتیں

ہماری بہت ہی عزیز فرشتہ صفت بیٹی ماہ محل پر نورِ امامت کی شعاعیں برستی رہیں!

مَیں اِنتہائی خیر خواہی اور قلب کی گہرائی سے "یا علی مدد" کی مُقدّس دعا کرتا ہوں، اور اس پُر حکمت دُعا میں اپنی بہت ہی پیاری بیٹی کے ساتھ وہاں کے جملہ عزیزوں کو بھی یاد کرتا ہوں، خُداوندِ قدّوس اُن سب کو نوازے! دونوں عالم کی کامیابی اور سربلندی عنایت فرمائے!

عزیز بیٹی، بہت ہی عزیز بیٹی! ہمیں معلوم ہے، فون پر آپ کو بتایا گیا ہے کہ آپ کے والدِ محترم کا انتقال ہو چکا ہے،.... اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن (ہم اور ہمارا سب کچھ خدا کی ملکیّت ہے اور ہم وقتی طور پر بھی اور دائمی طور پر بھی اُسی کی طرف لوٹنے والے ہیں) یہ اِس سلسلے میں قرآنِ پاک کی ایک تعلیم ہے، جس پر ہم سب کا ایمان ہے، چونکہ آپ اور ہم امامِ برحق صلوات اللہ علیہ کے عِلمی سپاہی ہیں، لہٰذا آیئے ہم معمُولی اور رسمی باتوں کو چھوڑ کر کچھ حقیقی عِلم کی باتیں کریں، تاکہ اس سے

ایک طرف مرحوم کے لئے کوئی تحفۂ ثواب ہو، اور دوسری طرف علمی لشکر کی معلومات میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہو سکے۔

۱۔ موت کی بہت سی قسمیں ہیں، مگر سب سے عالی شان اور پُر حکمت موت وہ ہے، جو خدا کے دوستوں یعنی مومنین سے متعلّق ہے، انبیاء و ائمہّ علیہم السّلام دوستانِ خدا کے سردار ہیں، چنانچہ حدیثِ شریف میں ارشاد ہے کہ "موت مومن کا گلدستہ ہے۔" گلدستہ کتنا خوبصورت اور پیارا ہوتا ہے، اس میں کیسی رنگینی اور دلکشی ہوتی ہے، اس کی خوشبو سے یکایک قلبِ بشر میں فرحت و شادمانی کی ایک لہر دوڑنے لگتی ہے، یہ تو صرف چند ظاہری اور مادّی پھولوں کے مجموعے کی بات ہوئی اور اگر ایسا کوئی گلدستہ نہ مرجھانے والے لازوال اور غیر فانی پھولوں کا ہو، اور وہ محبوبِ جان کی جانب سے آئے، تو پھر مسرّت و شادمانی کا ایک عجیب طوفان برپا ہوگا، یہ مومن کی موت کی مثال ہے، تاہم قانونِ حکمت کا یہ تقاضا ہے کہ جب تک رُوح جسم سے جُدا نہیں ہوتی، تب تک کوئی بھی خوشی طوفانی قسم کی نہ ہونی چاہیئے، کیونکہ اِنسان جس طرح شدید غم کے بوجھ کو برداشت نہیں کر سکتا، اسی طرح وہ حد سے زیادہ خوشی کا بھی متحمّل نہیں ہو سکتا ہے۔

۲۔ قرآنِ حکیم میں موت سے متعلّق جو کُلیّہ (عام قاعدہ) ہے (۳/۱۸۵) اس کی روشنی میں صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ ہر وہ جان (نفس) جو اللہ کے معیار کے مطابق جان کہلاتی ہو، وہ موت کی وجہ سے معدوم یا نیست و نابود نہیں ہوتی، بلکہ وہ موت کے بہت سے تجربات

سے گزرتی ہے، کیونکہ رُوحانی موت دراصل ایک دُنیا ہے، اس میں یقین و معرفت کے بھید ہی بھید ہیں، یہی سبب ہے کہ قرآنِ حکیم نے اپنی مخصوص حکمت کی زبان میں موت کو چاہنے اور دل میں اس کی آرزو پیدا کرنے کی تعلیم دی ہے، کیوں نہ ہو جبکہ یہ درسگاہِ علم و معرفت اور بہشتِ برین کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ہے (۲/۹۴)

۳۔ موت کی حکمتیں عظیم ہیں، جیسے سُورۂ مُلک (۶۷/۱-۲) میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: وہ (یعنی خُدا) بہت برکت والا ہے جس کے ہاتھ میں (ہر چیز کی عقلی و رُوحانی) بادشاہی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا تاکہ تمھاری آزمائش کرے کہ تم میں کون شخص عمل میں زیادہ اچھا ہے (۶۷/۱-۲)

جیسا کہ دانشمند مومنین اس سِرِّ عظیم سے واقف و آگاہ ہیں کہ قرآنِ مُقدّس میں جہاں جہاں دستِ خُدا کا ذکر فرمایا گیا ہے، وہاں ذاتِ سُبحان کے اصل اور سب سے خاص خزانے کا ذکر ہوتا ہے، جیسا کہ کتاب "گنجِ گرانمایہ" میں اس حقیقت کی وضاحت کی گئی ہے چنانچہ مذکورۂ بالا ارشاد میں بزبانِ حکمت یہ فرمان ہُوا ہے کہ جسمانی پیدائش کے بعد رُوحانی جنم ہے، پھر رُوحانی موت کا تجربہ ضروری ہے، اور آخر میں انبعاث کا مرحلہ ہے، تاکہ قبضۂ قُدرت میں جو بادشاہی ہے اس کی برکتوں سے فیض حاصل کیا جائے۔

خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ (اُس نے موت اور حیات کو پیدا

کیا، یہ انسان کی سب سے اعلیٰ موت اور سب سے پاکیزہ زندگی کا بیان ہے، وہ رُوحانی موت اور انبعاث ہے، اگر یہ جسم کی بات ہوتی تو وہ اس طرح ہوتی اُس نے حیات اور موت کو پیدا کیا" کیونکہ ظاہر ہے کہ پہلے تو جسمانی پیدائش ہے، پھر موت، نیز یہ بھی سوچنا ہے کہ جسمانی موت پر لفظِ خَلَقَ (پیدا کیا) کا بحقیقت اطلاق نہیں ہو سکتا ہے، کیونکہ یہ موت جسم سے الگ بذاتِ خود کوئی مخلوق شئی نہیں کہ محسوس ہو سکے، اس کے برعکس یہ کہنا بالکل درست اور حقیقت ہے کہ خُدا تعالیٰ کے معیار کے مطابق جیتے جی انبعاث سے قبل کی زندگی موت اور مخلوق ہے، مُوت اس معنیٰ میں بھی کہ حضرت عزرائیل علیہ السّلام نے اِس میں بار بار قبضِ رُوح کا عمل کیا۔ اور مخلوق اِس لئے کہلائے کہ وہ موجُود اور محسوس ہے۔

۴۔ اگرچہ ہر مومن جیتے جی رُوحانی موت کا مزہ چکھ نہیں سکتا، لیکن اس مقصد کے پیشِ نظر امامِ زمانؑ کی فرمانبرداری بیحد ضروری ہے، تاکہ اس کی رُوح کا ذرّہ حدُودِ دین میں سے کسی سے واصل ہو جاتے (آپ اِس سلسلے میں کتابِ "وجہِ دین" گفتارِ ۲۶ کا مُطالعہ کر سکتے ہیں) ایسے افرادِ مومنین حدُود کے وسیلے سے رُوحانی مراحل کو طے کر سکتے ہیں، جیسا کہ خُداوند تعالیٰ کے کلامِ حکمت نظام میں ہے:۔

وتحمل اثقالکم الیٰ بلدٍ لّم تکونوا بلغیہ اِلّا بِشِقِّ الاَ نفُسِ (۱۶/۷) اور وہ (چوپائے) تمہارے بوجھ ایسے شہر کو لے جاتے ہیں جہاں تم اپنی جانوں (رُوحوں) کے ذرّات بنائے

بغیر نہیں پہنچ سکتے تھے۔ چوپایوں سے حدودِ دین مُراد ہیں، جن کے سہارے پر مومنین شہرِ رُوحانیت میں پہنچ جائیں گے، اور بہشت میں سابقہ رُوحانی سفر کی ہر ہر منزل کا مُشاہدہ ہوگا۔

۵۔ جس طرح جسمانی موت سے کوئی بھاگ نہیں سکتا، اِسی طرح رُوحانی موت بھی کسی نہ کسی صورت میں آنے والی ہے، جیسا کہ سورۂ نساء (۷۸/۴) میں ہے: اینما تکونوا یُدرککم الموتُ ولوکُنتم فی بروجٍ مُشیّدۃٍ (۷۸/۴) تم چاہے کہیں بھی ہو وہاں ہی تُم کو موت آدبا دے گی، اگرچہ تم مضبُوط قلعوں ہی میں ہو۔ مضبُوط قلعوں کی تاویل ہے امامِ زمانؑ اور آپؑ کے حدود، ان روحانی اور علمی قلعوں میں رہنے والوں پر بھی روحانی موت کا تجربہ گزرے گا، کیونکہ اِسی میں قیامت سے متعلّق سارا علم پوشیدہ ہے۔

۶۔ اِس سِلسِلے کا ایک اور ارشاد سُورۂ بقرہ (۲۴۳/۲) میں اس طرح ہے: (اے رسُول) کیا تُم نے اِن لوگوں کے (حال) پر نظر نہیں کی، جو موت کے ڈر کے مارے اپنے گھروں سے نکل بھاگے اور وہ ہزاروں آدمی تھے تو خُدا نے اُن سے فرمایا کہ سب کے سب مر جاؤ (اور وہ مر گئے) پھر خُدا نے انھیں زِندہ کیا، بے شک خدا لوگوں پر بڑا مہربان ہے، مگر اکثر لوگ اس کا شکر نہیں کرتے۔ یہ لوگ کون تھے جو ہزاروں کی تعداد میں بلکہ بے شمار تھے؟ اور اللّٰہ نے ان سے کیوں فرمایا کہ مر جاؤ؟ یہ ذرّاتِ رُوح تھے جو صورِ اسرافیلؑ کے خوف سے اشخاص کی قبرستانوں

سے نکل کر کربلا تے والے کی طرف جارہے تھے، جہاں حدودِ دین میں سے کسی کی ذاتی قیامت اور روحانی موت واقع ہورہی تھی، اِسی کے ساتھ ساتھ ان بے شمار ذرّات پر بھی پُرحکمت موت آئی، اور اِسی طرح اُن کا انبعاث بھی ہوگیا، مگر یہ سب کچھ غیر شعوری حالت میں تھا، اور ہاں یہ عمل بہشت میں بطریقِ رُوحانی عکس سامنے آئے گا۔

۷۔ سُورۂ دُخان (۴۴/۵۶) میں فرمایا گیا ہے: لا يذوقون فيها الموت الّا الموتة الاولى (۴۴/۵۶) وہ لوگ بہشت میں موت کا ذائقہ نہ چکھیں گے بجز اُس موت کے جو دُنیا میں آچکی تھی۔ یعنی جنّت میں رُوحانی موت نہیں، وہ تو براہ راست یا بالواسطہ شعوری یا غیر شعوری طور پر دُنیاوی زندگی میں واقع ہو چکی تھی، اب بہشت میں صرف اُس عظیم کارنامے کا نظارہ کرنا اور علمی لذّت اُٹھانا ہے۔

۸۔ حضرت سلیمان علیہ السّلام کی رُوحانی موت کا تذکرہ اِس طرح ہے: پھر جب ہم نے سلیمان پر (رُوحانی) موت مقرر کیا تو کسی چیز نے اُن کے مرنے کا پتہ نہ بتلایا مگر گھُن کے کیڑے نے کہ وہ سلیمان کے عصا کو کھاتا تھا سو جب وہ گر پڑے تب جنّات کو حقیقت معلوم ہُوئی کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو اس خواری کے عذاب میں نہ رہتے (۳۴/۱۴) دابة الارض (گھُن کا کیڑا) سے کچھ رُوحیں یعنی یاجوج وماجوج مُراد ہیں، عصا کا مطلب یہاں رُوحِ حیوانی ہے، کیونکہ اسی سے اِنسانی رُوح کو سہارا ملتا رہتا ہے، مگر اس لاٹھی کو یاجوج وماجوج چاٹ لیتے ہیں، گرنے کا مطلب عملِ عزرائیلؑ

کی خاطر لپیٹ جاتا ہے۔

۹۔ عالمِ شخصی کی زمین میں زندوں اور مُردوں کی لاتعداد رُوحیں جمع ہیں، سورۂ مرسلات میں فرمایا گیا ہے، (۷۷/۲۵-۲۶) الم نجعل الارض کفاتاً۔ احیاءً و امواتاً (۷۷/۲۵-۲۶) کیا ہم نے زمین کو زندوں اور مُردوں کی سمیٹنے والی نہیں بنایا۔ ظاہری زمین پر لوگ ہر جگہ بستے ہیں، اور مردے ہر مقام پر دفنائے یا جلائے جاتے ہیں، اس میں سمیٹنے کی کوئی بات نہیں، مگر جب انفرادی قیامت قائم ہو جاتی ہے، تو اس وقت اِنسانِ کامل کی شخصیّت کی زمین تمام زِندوں اور مُردوں کی ارواح کو سمیٹ لیتی ہے۔

۱۰۔ روحانی موت دراصل رُوح کے عرُوج و ارتقاء کا سلسلہ ہے، لہٰذا خُدا کے دوست اس کو بہت چاہتے ہیں، جس کی دلیل اس آیۂ کریمہ میں موجُود ہے: (اے رسُولؐ) تم کہہ دو کہ اے یہُودیو اگر تُم یہ خیال کرتے ہو کہ تم ہی خدا کے دوست ہو اور لوگ نہیں تو اگر تم (اپنے دعوے میں) سچّے ہو تو موت کی تمنّا کرو (۶۲/۶) اس سے ظاہر ہے کہ رُوحانی موت کی تمنّا خُدا کی دوستی کی علامت ہے، کیونکہ جسمانی موت کی آرزو کوئی ایسا کافر بھی کر سکتا ہے، جو دُنیا کی کسی سخت تکلیف سے تنگ آچکا ہو، اور ایسا شخص اللہ کا دوست نہیں ہو سکتا، یہاں یہ بات بھی یاد رہے کہ رُوحانی موت کی تمنّا کسی بھی عنوان سے ہو سکتی ہے، جیسے روحانی ترقّی، دیدارِ خُداوندی، حصُولِ معرفت وغیرہ کو چاہنا۔

۱۱۔ سُورۂ اَنعام (۶/۱۲۲) میں اِنسانِ کامل کی رُوحانی موت اور

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

حیاتِ طیبہ کا بیان اِس طرح فرمایا گیا ہے: اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا (٦/١٢٢) کیا جو شخص (پہلے) مُردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کیا اور اس کے لئے ایک نور بنایا جس کے ذریعہ سے وہ لوگوں (کے عالمِ شخصی) میں چلتا ہے اُس شخص کا سا ہو سکتا ہے جس کی یہ حالت ہے کہ (ہر طرف سے) اندھیروں میں (پھنسا ہوا) ہے کہ وہاں سے کسی طرح نکل نہیں سکتا یہ زبانِ حکمت کی باتیں ہیں، لہٰذا ان کی سطح بہت بلند ہے، چنانچہ یہاں مُردہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انسانِ کامل ملۂ عزرائیلی سے ہو کر آگے گزر چکا تھا، جس کو مقامِ انبعاث پر جیا طیبہ میں زندہ کر کے نورِ کامل مقرر کیا گیا، وہ لوگوں کے باطن میں چل ا ہے، اور ایسا شخص صرف اور صرف امامِ زمان علیہ السّلام ہیں، ا اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، کیونکہ لوگوں کے اندر جب مُضِلّ راہ کرنے والا، یعنی شیطان) داخل ہو کر اپنا کام کر سکتا ہے، تو ہا برحق علیہ السلام کی رسائی انسانوں کے دل و دماغ تک کیوں نہ ہو۔ والسّلام۔

پائے مومنان

نصیر الدین نصیر ہونزائی

٦- جنوری ١٩٨٥ء

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

Table of Contents